مختلف مضامین

قرآنی سیریز - ۲

علّامہ نصیرالدّین نصیر ہونزائی

کے ٹرانسکرائب لیکچرز

تمہید

استادِ بزرگوار علامہ صاحب ؒ نے اپنی صد سالہ عمرِ گرانمایہ میں اپنی زبانِ فیض بار اور قلمِ جواہر نگار سے کتابوں کے علاوہ آڈیو لیکچرز کی صورت میں ایک بیش بہا خزانہ عالمِ انسانیت کے لئے عطا کیا ہے۔ اِن لیکچرز کی اہمیت کے حوالے سے آنجناب خود فرماتے ہیں:

''ہمارے کیسٹوں میں جو تقاریر ہیں وہ بنیادی اور اساسی مواد کا کام دیں گے، یعنی اُن سے اسماعیلی مذہب پر ریسرچ میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ میرے نزدیک ہر کیسٹ کا مواد ایک کتابچہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں بڑی اہم باتیں ریکارڈ ہوئی ہیں۔ کیسٹوں کے قیمتی مواد کو محفوظ کر لینا ضروری ہے، کیونکہ یہ ہماری پیاری جمعیت کی دولت ہے، یہ ہمارے علمی سرمایے کا ایک اہم حصّہ ہے، اور ہم کو یقین ہے کہ مستقبل میں ہمارے ان علمی کاموں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہونے والا ہے، ہماری تحریروں کے ایک ایک پُرزے پر ریسرچ ہوگی، کیونکہ ہماری نگارشات میں امامِ عالیمقامؑ کی نورانیت و روحانیت براہِ راست کارفرما ہے''۔ (غیر مطبوعہ)

استادِ گرامی ؒ کی اِس روشن ہدایت کے پیشِ نظر اِن گرانمایہ درّ و مرجان کو ضبطِ تحریر میں لانے کا انتہائی اہم اور دقیق کام استاد بحرالعلوم صاحب کی سرپرستی میں شروع کیا گیا ہے۔ اور آپ نے اِس سلسلے میں خانۂ حکمت کے تمام سینٹرز میں جا کر اس کام کی اہمیت کے حوالے سے آگاہی اور رہنمائی فرمائی ہے اور ناچیز کو اِن لیکچرز کو تحریر میں لانے اور منظم کرنے کی ذمہ داری دی ہے اس سلسلے میں کئی احباب انتہائی جانفشانی سے کام کر رہے ہیں۔ ان خزائن کو جماعت اور دنیائے انسانیت تک پہنچانے کے لئے محترم مصطفیٰ مومن صاحب نے اسے (ebook) کی صورت میں پیش کرنے میں ہماری مدد فرمائی ہے۔

ناچیز نسرین اکبر

قرآنی سیریز ۔ ۲

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضمون	لیکچر نمبر	صفحہ نمبر
۱	سورۂ جنّ کی تاویلی حکمت (۷۲: ۱۔۱۵)، اللہ کی صفات حدودِ دین سے ثابت	ق۔ ۱۱	۱
۲	سورۂ تطفیف (۸۳) کی حکمتیں، نامۂ اعمال دراصل امام علیہ السلام ہیں۔	ق۔ ۱۲	۱۱
۳	سورۂ دھر (۷۶: ۱۔۷) سے چند بنیادی حقائق	ق۔ ۱۳	۲۰
۴	تسخیرِ کائنات۔ خدا کی نشانیاں	ق۔ ۱۴	۲۸
۵	مشرق اور مغرب کی تاویل، انبیاءؑ کے مراتب، کتابِ نور	ق۔ ۱۵ الف	۳۴
۶	کتابِ نور	ق۔ ۱۵ ب	۴۴
۷	سورۂ بروج (۸۵) کے تاویلی اسرار (از کتاب سوغاتِ دانش)	ق۔ ۱۶	۵۱
۸	سورۂ قیامت (از کتاب سوغاتِ دانش)	ق۔ ۱۷	۶۶
۹	سورۂ طٰہٰ (۲۰: ۱۔۶) کی حکمتیں	ق۔ ۱۸	۷۹
۱۰	قرآن میں تصورِ ایمان اور اس کا دوسرے موضوعات سے ربط	ق۔ ۱۹	۹۱
۱۱	قرآن ایک معجزہ	ق۔ ۲۰	۱۰۲

اُستادِ بزرگوار علامہ نصیر الدین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُرحکمت بیان

عنوان: سورۂ جن کی تاویلی حکمت (۷۲: ۱۔ ۱۵)، اللہ کی صفات حدودِ دین سے ثابت ہیں

کیسٹ نمبر: Q-11 تاریخ: دسمبر/ ۱۹۷۸ء کراچی

Click here for Audio

۔۔۔ میں علم میں جمع کر کے اُن سے استفادہ کیا جائے گا اور اس سے جماعتوں کو بڑا فائدہ پہنچے گا۔ سورۂ جنّ کے پہلے رکوع میں جنّات کا کچھ ذکر ملتا ہے اور اگر ہم غور و فکر سے دیکھیں، تو اِس میں کافی باتیں ملتی ہیں اہم باتیں۔ چونکہ ہم جنّ کو اہمیت دیئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں، اِس لئے کہ خالقِ کائنات کی شناخت مخلوق کی شناخت میں ہے اور رُوح کی شناخت کے سلسلے میں بھی مخلوقِ لطیف کی شناخت لازمی ہوتی ہے اور ہمارے نزدیک جنّات مخلوقاتِ لطیف میں سے ہیں، اِس لئے اِن مخلوقات کی تحقیق اور قرآنی باتیں ضروری ہیں، تو میں قرآن ہی سے شروع کرتا ہوں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ قُلۡ اُوۡحِیَ اِلَیَّ اَنَّہُ اسۡتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الۡجِنِّ فَقَالُوۡۤا اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا یَّہۡدِیۡۤ اِلَی الرُّشۡدِ فَاٰمَنَّا بِہٖ (۷۲: ۱۔ ۲)۔

اللہ جلیل و جبّار کا ارشاد ہے اور اپنے حبیب سے فرماتا ہے کہ: اے رسول صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ مجھ پر وحی ہوئی اِس بارے میں کہ جنّات میں سے ایک جماعت نے سُن لیا اور انہوں نے کہا کہ ہم نے سُنا ہے ایک عجیب قرآن یعنی وحی کے ذریعے سے مجھ کو خبر ہوئی ہے، کہ جنّات میں سے ایک جماعت کو اِس عالی قدر وحی کے سلسلے میں پتا چلا، اُن کو خبر ہوئی اور اس کے نتیجے پر اُن جنّات نے کہا، کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سُنا ہے جو کہ بھلائی کی راہ دکھاتا ہے، تو ہم اِس پر ایمان لے آئے یہ اُن جنّات کا کہنا ہے اور جس کے بارے میں اللہ، رسولؐ سے فرماتا ہے کہ آپؐ یوں کہہ دیجئے کہ جنّات نے ایسا کہا۔

"وَلَنۡ نُّشۡرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا" (۷۲: ۲) اب اِس عجیب قرآن کے سُننے کے بعد ہم اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گے۔ اِس مقام پر کچھ وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے، کچھ نتائج اخذ کرنے کی ضرورت ہے، اور اُن کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے کہ جنّات بھی انسانوں کی طرح دین کے محتاج ہیں، ایمان کے محتاج ہیں، ہدایت کے محتاج ہیں، اِس لئے جنّات کے اِس گروہ نے حضور اکرم صلعم کے وسیلے سے جو وحی کی باتیں سنیں، قرآن کا پڑھنا اور پڑھانا جب سُنا تو اُن جنّات نے ایمان لے آیا۔ اب یہاں سوچنے کا مقام ہے کہ جنّات نے بھی ایمان لے آیا، پس وہ

مسلمان ہو گئے یعنی آنحضرتؐ کی اُمتی میں سے ہو گئے۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنّات یہود، نصاریٰ، مسلم، کافر ،مشرک، منافق، اچھے اور بُرے ہر قسم کے ہو سکتے ہیں۔ آگے چل کر خود قرآن کی زبان سے آپ کو اِس حقیقت کا پتا چلے گا کہ ایسا ہی ہے اور اِس سے معلوم ہوا کہ جنّات کے لئے ہدایت کی ضرورت ہے، دین و ایمان کی ضرورت ہے اور عقل و دانش کی روشنی کی ضرورت ہے، بحیثیتِ مجموعی کہا جائے تو جنّات کے دو گروہ ہیں اور یمان والے اور غیر ایمان والے، مشرک اور مُوَحِّد۔

پھر ارشاد ہوتا ہے جنات کی طرف سے جنّات کی زبان سے: ''وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا'' (۷۲:۳) اور اِس قرآن کے سننے کے نتیجے میں ہم یہ بھی کہتے ہیں، کہ ہمارے پروردگار کی شان بہت بڑی ہے، اُس نے نہ کسی کو بیوی بنایا اور نہ بیٹا، بیٹی۔ اِس مقام پر اسماعیلی مذہب کی ایک اصطلاح ملتی ہے جو''جدّ'' ہے، جس کا یہاں ترجمہ شان کیا ہے: ''وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا'' اور یہ کہ ہمارے پروردگار کا جو جدّ فرشتہ ہے وہ بہت ہی بلندی پر ہے۔ آپ نے حدود کے علم کے سلسلے میں مطالعہ کیا ہوگا، ہمارے بزرگانِ دین کی کتابوں میں ہے، کہ جدّ، فتح، خیال، تو جہاں پر ہمارے دین کے درخت کی جڑیں چار ہیں یعنی عقلِ کُلّی، نفسِ کُلّی، ناطق اور اساس، وہاں پر اُس دین کے درخت کی شاخیں چھ ہیں، جدّ، فتح، خیال، امام، حجّت، داعی۔ آپ جانتے ہیں کہ درخت کی اِس مثال میں شاخوں کا تعلّق بلندی سے ہے، جڑوں کی نسبت پستی سے ہے، اِس مثال میں یہ کہنا صحیح ہے کہ جو جدّ فرشتہ ہے وہ چھ فروع میں سب سے بلند ہے یعنی بلند ترین فرع ہے، بلند شاخ کی حیثیت سے ہے۔ اِس بات کے سننے سے آپ کو یقیناً مزہ آئے گا کہ درخت کو قوت جڑوں کے وسیلے سے حاصل ہوتی ہے لیکن پھل شاخوں میں لگتا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ اگر اِس مثال میں امام، حجّت، داعی اِس درختِ دین کی جسمانی شاخیں ہیں اور جدّ، فتح، خیال رُوحانی شاخیں ہیں، تو مومنین کی پہلی رسائی درختِ دین کی جسمانی شاخوں تک ہونی چاہئے اور واقعہ بھی ایسا ہی ہے، کہ مومنوں نے امام، حجّت، داعی سے، یہاں حجّت سے مراد پیر ہے، علم و دانش کا پھل حاصل کیا اور درختِ دین کی رُوحانی شاخوں سے براہِ راست اِس وقت فائدہ نہیں ملتا ہے لیکن امام، حجّت اور داعی کے وسیلے سے یا خود جب رُوحانی ترقّی کی منزلوں سے گزریں، آگے جائیں تو ذاتی طور پر بھی رُوحانیت کی اُن شاخوں سے فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اِس معنی میں یہاں جو جنّات کی زبان سے کہا گیا ہے کہ پروردگار کا جدّ بہت اعلیٰ ہے تو صحیح ہے، کہ رسائی کے لحاظ سے رُوحانیت کی یہ شاخ بلند ترین ہونی چاہئے اور اِس سے مُراد اسرافیل فرشتہ ہے جو سب سے اُوپر ہے، اُس کے نیچے میکائیل فرشتہ ہے جس کا نام فتح ہے اور اِس کے نیچے جبرائیل فرشتہ ہے جس کا نام خیال ہے۔

چلئے ہم نے تھوڑا سا خاکہ دیا بعد میں آپ سوالات کریں یا کہ کتابوں کی مدد سے اِسکی مکمل وضاحت کو سمجھ پائیں، چونکہ ہمارا موضوع جو ہے وہ جنات ہیں، اِس مطلب کی اتنی وضاحت کے بعد ہم آگے چلتے ہیں اور ہاں! ایک نکتہ

ضروری ہے وہ یہ کہ جو فرمایا گیا کہ: ''مَا اتَّخَذَ صَاحِبَۃً وَّلَا وَلَدًا '' (۷۲:۳) پروردگار کی نہ کوئی بیوی ہے اور نہ کچھ بچّے ہیں، اِس کے بارے میں، میں ضرور یہ گزارش کروں گا تاویل کے طور پر، کہ اللہ تعالیٰ کی جو صفات ہیں وہ حدودِ دین سے ثابت ہیں، ایک طرح سے دیکھا جائے تو اللہ موصوف نہیں ہے، اُس کی کوئی صفت نہیں ہے بلکہ صفت رُوحانی اور جسمانی حدود کی ہیں اِن ہی حدود کی صفات کو خدا اپنی ذات سے نسبت دیتا ہے، چنانچہ یہاں بیوی بچّے نہ ہونے کی جو صفت بیان کی گئی ہے اُس کا تعلّق جدّ فرشتہ سے ہے اور اِسی نسبت سے یہ صفت خدا کی صفت ہے لیکن براہِ راست خدا کی صفت نہیں ہے اِس لئے، کہ خدا کے لئے یہ کوئی بڑی صفت نہیں ہے، کہ اُس کی بیوی نہ ہو بچّے نہ ہوں اُس کے لئے کوئی بڑی صفت نہیں ہے، بہت سی مخلوقات ہیں اور کچھ انبیاء بھی ایسے گزرے ہیں اور دُنیا میں اولیاء اور درویش بھی گزرے ہیں جن کی بیوی نہ تھی، بچّے نہ تھے، تو ایک ایسی عام صفت کو اللہ کیوں اہمیت دے۔ اللہ کی صفت ایسی ہونی چاہئے کہ وہ بے مثال ہو وہ یکتا ہو وہ بس اُسی کے لئے مخصوص ہو تو ایسی صفت واقعاً خدا کی صفت قرار پاسکتی ہے۔

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے کہ: ''وَّاَنَّہٗ کَانَ یَقُوۡلُ سَفِیۡہُنَا عَلَی اللّٰہِ شَطَطًا'' (۷۲:۴) جنّات کہتے ہیں کہ ہم میں سے بے وقوف خدا کے بارے میں حد سے زیادہ لغو باتیں بکا کرتے تھے، تو جنّات کا یہ گروہ کہتا ہے اُن کی قوم کی طرف سے، اُن کے لوگوں کی طرف سے کہ اگر جنّات ہیں یا مخلوق لطیف ہیں تو وہ ایمان اور علم و عمل کے لحاظ سے کچھ اعلیٰ تو نہیں ہو سکتے ہیں، کیونکہ اُن میں ادنیٰ بھی ہیں اور غلط بولنے والے بھی ہیں، غلط کام کرنے والے بھی ہیں، اِس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جنّات اپنی قوم کی طرف سے، جنّات کا یہ گروہ اپنی قوم کی طرف سے وضاحت کرتا ہے کہ ہماری قوم میں سے کچھ لوگ خدا کے بارے میں حد سے زیادہ لغو باتیں بکا کرتے تھے یعنی اِن کو جب قرآن کی روشنی ملتی ہے جب آنحضرتؐ کی ہدایت کا رُوحانی فیض ملتا ہے تو اِس روشنی میں جنّات کی یہ جماعت تحقیق کرتی ہے وضاحت کرتی ہے کہ اُن کی پہلی حالت کیا تھی یا اُن کی قوم کا کیا خیال ہے اُسکی یہ جماعت وضاحت کرتی ہے اور یہاں پر ایک خاص نکتہ بھی سامنے آتا ہے، کہ رسولِ اکرمؐ کی ہدایت کے دو پہلو تھے ایک پہلو کا تعلّق انسانوں سے تھا جب کہ دُوسرے پہلو کا تعلّق جنّات سے، وہ رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ اِس معنی میں تھے کہ اُن کی ذاتِ اقدس سے ہدایت کی روشنی ساری مخلوقات کو پہنچتی تھی۔ ہم کو ایک فکر انگیز (idea) مل گیا، ایک تصوّر مل گیا کہ آنحضرتؐ نے جو پیغام لایا تھا یا حضورؐ پر جو اللہ کی ایک مقدّس کتاب نازل ہوئی تھی اُس کے دو پہلو تھے ظاہری پہلو اور باطنی پہلو، تو باطنی پہلو کا تعلّق لطیف مخلوق سے تھا اور ظاہری پہلو کا تعلّق کثیف مخلوق سے یعنی جنّات نے جو کچھ سُنا تو انہوں نے اپنے طور سے سُنا وہ رُوحانی تھے تو رُوحانی طور پر سنا، وہ باطنی تھے اِس لئے باطنی طور سے سُنا کچھ دُوسرے لوگوں کی طرح محفل میں حاضر ہو کر نہیں سُنا۔ اگرچہ یہاں صرف ایک ہی جماعت کا ذکر ہے جنّات میں سے لیکن ہمیں ماننا چاہئے کہ جنّ و انس میں سے سب کو خداوندِ عالم نے ہدایت کے لئے اہتمام فرمایا ہے۔

فرمایا جاتا ہے: ''وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنۡ لَّنۡ تَقُوۡلَ الۡاِنۡسُ وَالۡجِنُّ عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا'' (۵:۷۲) جنّات کہتے ہیں کہ ہم نے اِس سے قبل یہ گمان کیا تھا، کہ انسان اور جنّات اللہ پر جھوٹ کی نسبت نہیں دیں گے، ہم کو یہ گمان تھا لیکن اب پتا چلا کہ کتنے لوگ گمراہ ہیں اور کتنے جنّات رستے سے باہر ہیں۔ ''وَّاَنَّہٗ کَانَ رِجَالٌ مِّنَ الۡاِنۡسِ یَعُوۡذُوۡنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الۡجِنِّ فَزَادُوۡھُمۡ رَھَقًا'' (۶:۷۲) جنّات کی یہ جماعت صراحت کرتی ہے، وضاحت کرتی ہے اور خبر فراہم کرتی ہے کہ انسانوں میں سے کچھ مرد یا انسانوں میں سے کچھ آدمی ایسے تھے کہ وہ جنّات کے پاس پناہ لیتے تھے، جنّات سے مدد چاہتے تھے تو ایسے لوگوں کی سرکشی بڑھ گئی تھی۔ جنّات کا یہ گروہ کہتا ہے کہ ہم کو پتا ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جو کہ جنّات سے مدد لیتے تھے اور جنّات کے وہاں پناہ لینے کی کوشش کرتے تھے، تو کتنی اُن کی غلطی ہے کہ وہ جنّات کو ترجیح دیتے ہیں حالانکہ جنّات کچھ بھی نہیں ہیں، جس طرح انسان ہیں اِسی طرح جنّات ہیں تو جنّات کی کوئی اہمیت نہیں ہے، یہ جنّات کی زبان ہی سے بات بنتی ہے، پروردگارِ عالم کی حکمت کتنی عظیم ہے کہ وہ حقائق و معارف کو کیسے کیسے نرالے اور انوکھے طریقوں سے پیش کرتا ہے۔ کس کو خیال ہوگا کہ جنّات کے قصّے میں ایسی مطلب کی باتیں ہیں ایسی بنیادی حقیقتیں ہیں جن کو بغور سننے سے ہمارے علم میں اضافہ ہوسکتا ہے یعنی خود جنّات ہی کہتے ہیں کہ جنّات کو ترجیح دینا فضول بات ہے۔ جنّات اگر لطیف ہیں تو کیا ہوا؟ شیطان بھی لطیف ہے، لطیف میں کچھ بھی نہیں ہے، تو لطیف کے دو حصّے ہیں کچھ لطیف مخلوق بُرائی کی طرف ہے اور کچھ بھلائی کی طرف ہے اور یہی حال کثیف کا بھی ہے، کہ سب کثیف خراب نہیں ہیں اور سب کثیف اچھے بھی نہیں ہیں، تو جس طرح کثیف کے دو حصّے ہیں اِسی طرح لطیف کے دو حصّے ہیں۔ جسمِ کثیف میں بھی فرمانبردار ہیں اور نافرمان بھی ہیں اِسی طرح لطیف والے بھی فرمانبردار بھی ہیں اور نافرمان بھی ہیں اُن کے بھی دو گروہ ہیں اِن کے بھی دو گروہ ہیں لہٰذا کثیف لطیف سے مدد کیوں چاہے؟ تو یہ جنّات کی زبان سے وضاحت ہوتی ہے۔

''وَّاَنَّھُمۡ ظَنُّوۡا کَمَا ظَنَنۡتُمۡ اَنۡ لَّنۡ یَّبۡعَثَ اللّٰہُ اَحَدًا'' (۷:۷۲) جنّات کہتے ہیں کہ جس طرح تم انسانوں میں سے بعض کا یہ خیال ہے کہ خدا، مُردوں کو نہیں جِلائے گا اُن کو دوبارہ زندہ نہیں کرے گا، اِسی طرح جنّات میں سے بھی کچھ کا یہی خیال تھا لیکن یہ خیال غلطی پر مبنی ہے۔ ''وَّاَنَّا لَمَسۡنَا السَّمَآءَ فَوَجَدۡنٰھَا مُلِئَتۡ حَرَسًا شَدِیۡدًا وَّشُھُبًا وَّاَنَّا کُنَّا نَقۡعُدُ مِنۡھَا مَقَاعِدَ لِلسَّمۡعِ فَمَنۡ یَّسۡتَمِعِ الۡاٰنَ یَجِدۡ لَہٗ شِھَابًا رَّصَدًا'' (۸:۷۲۔۹) جنّات کہتے ہیں اور یہ بات بھی ہے کہ ہم نے رُوحانیت کے آسمان کو مَس کر کے دیکھا، ہم نے رُوحانیت کے آسمان کی طرف پرواز کر کے دیکھا، اُوپر جانے کے لئے ملاءُ الاعلیٰ کے دربار تک پہنچنے کے لئے، یہ ملاءُ الاعلیٰ رُوحانیت کا ایک مقام ہے، آپ اِس کو اچھی طرح سے نوٹ کریں، ملاءُ الاعلیٰ رُوحانیوں اور فرشتوں کے بڑے بڑے سردار ہیں، ملاء سردار کو کہتے ہیں اعلیٰ بلند ترین، فرشتوں اور رُوحانیوں کے وہ سردار جن کا مقام ایک اعلیٰ مقام ہے، وہاں پر حضرت باری تعالیٰ کے فیصلہ جات اور

خدائی بھیدوں کا تذکرہ ہوتا ہے،تو یہ شیاطین اُس دربارِ عالی کی طرف، جنّات وغیرہ کوشش کرتے ہیں اِس سلسلے میں جنّات کہتے ہیں کہ ہم نے رُوحانیت کے آسمان کو چھوا،مسح کیا، دیکھا، رسائی کی لیکن ہم نے اُس آسمان کوقوی نگہبانوں اور شعلوں سے بھرا ہوا پایا،قوی نگہبانوں، جس طرح دُنیاوی طور پر کہا جاتا ہے کہ چوکیدار، محافظ، سنتری تو جنّات کہتے ہیں جس کی ترجمانی خدا خود فرماتا ہے کہ جنّات کہتے ہیں کہ ہم نے رُوحانیت کے آسمان کومسح کرکے، (touch) کرکے دیکھا اور جب دیکھا تو اُس آسمان کوقوی مضبوط نگہبانوں اور شعلوں سے پُر پایا،یعنی خدا کا یہ منشاء نہیں ہے کہ اُس کی مرضی کے بغیر اُس کی اجازت کے بغیر کوئی اُڑنے والا اپنے بل بوتے پر آسمانِ رُوحانیت کی طرف پرواز کرے اور جس کے لئے خدا نے یہ اہتمام فرمایا ہے کہ آسمان پہ قوی محافظ مقرّر کر لئے ہیں جن کے پاس شعلے ہیں، وہ شعلے برسائے جاتے ہیں،کوئی مخلوقِ لطیف یا کوئی شیطان ملاءُ الاعلی کے دربار کی طرف جب پرواز کرنا چاہتا ہے اور رُوحانیت کے۔۔۔

دیکھیے جو باطن میں ہے اُس کی تشبیہ ظاہر میں بھی ہے جس طرح رُوحانیت میں ایک اعلیٰ دربار ہے اور وہاں پر ملاءُ الاعلی ہیں، اِسی طرح ظاہر میں بھی ایک دربار ہے اور وہ امامؑ کی شخصیت اُس کا حضور ہے، ظاہری طور پر کبھی کسی انسان کو خیال آتا ہے، ایک تو بہ کم سے کم آتی ہے کہ چلو امام کی تلاش کریں اور ہوسکتا ہے کہ یہی امام ہے، کسی بھی کمزور انسان کو ضمناً یہ خیال آتا ہے اور وہ اِس طرف آنا چاہتا ہے، جب آنا چاہتا ہے تو اُس کے سامنے سے ایک شعلہ آتا ہے اور شعلے سے اُس کو مارا جاتا ہے۔کیا ہے یہ شعلہ؟ چونکہ وہ شیطان ہے ایک ہی تنہا بات سے کیا ہوسکتا ہے، اور یہ شعلہ یہی ہے کہ امامؑ کے بارے میں کوئی شک، امامؑ کے بارے [میں] کوئی سوال کہ امامؑ کے بارے میں امامؑ کی بشریت، امامؑ کی جسمانیت، امام کا انسان ہونا، لوگوں کے درمیان رہنا اور بشری لباس میں ہونا ایسے تصوّرات ایسے خیالات اُس ظاہری انسان کے لئے آگ کے شعلوں سے کم نہیں ہیں، تو باطنی طور پر جس طرح باطنی مخلوق پر شعلے برسائے جاتے ہیں تو یہاں بھی امامؑ کے دربارِ عالی کی حفاظت کے لئے ایسا قوی بندوبست کیا گیا ہے اور شکوک وشبہات اور سوالات ومسائل کی آگ کے شعلے لوگوں پر ہر وقت برسائے جاتے ہیں، اُن کو ایسی باتیں چبھتی ہیں، کہ اُن کو وہ برداشت نہیں کرسکتے ہیں اور یہ بھی ایک حفاظت ہے، تو یہ بھی ایک حفاظت ہے، بیگانہ لوگوں کے لئے جو چیزیں شکوک وشبہات کے عنوان سے ہیں ہمارے لئے وہ پھول ہیں، روشنی ہے اُن کے اندر ہمارے لئے حکمتیں ہیں، ہمارے لئے علم ہے، ہمارے لئے ہر چیز میں شناخت ہے، علم و حکمت کا ایک ایک خزانہ ہے، خواہ وہ امامؑ کی بشریت ہو، امامؑ کا چلنا پھرنا ہو، امامؑ کی شادی بیاہ ہو یا امامؑ کی اور کوئی جسمانی اور انسانی چیز ہو، تو یہی چیزیں دُوسرے لوگوں کے لئے آگ کے شعلوں سے اور شہابِ ثاقب سے کم نہیں ہیں، تو وہ رُوحانیت کی صورتِ حال اور یہ ظاہری کیفیت بالکل ایک دُوسرے کی مانند ہے، اِسی لئے حفاظت کے بغیر کوئی چیز نہیں ہے۔

آپ نے دیکھا گلاب کے پھول کو، گلاب کے جھاڑ کو دیکھا، پھول کے قریب اور جھاڑ کے اُوپر

کانٹے ہیں، کیوں ہیں؟ کیا اُس میں کوئی حکمت نہیں ہے؟ ہے! یہ پھول کی حفاظت ہے، تو امامؑ کی بشریت جسمانیت اور دُوسری ایسی چیزیں جن کو دیکھ کر اہلِ ظاہر تشکیک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور راہِ فرار اختیار کرتے ہیں اِس میں حکمت ہے اُن کو تو بھاگنا چاہئے، تو دُنیا کے اندر ایک عام سے عام چیز کی بھی اللہ تعالیٰ نے حفاظت کر رکھی ہے، ایسے بڑے خزانے کی حفاظت نہ ہو، اور اِسی معنی میں کہا گیا ہے کہ امامؑ کے سات سو پردے ہیں ”چونکہ ہفت صد پردہ دارد آن امام“ یہی چیزیں پردوں کی حیثیت سے ہیں، حفاظت کے لحاظ سے پردے کہیے اور بھگانے کے لحاظ سے اِن کو شعلے کہیے دونوں باتیں ایک جیسی ہیں۔ ”وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا“ (۷۲:۹) اِس آسمانِ رُوحانیت سے قریب ہم ملاءُ الاعلیٰ کی باتوں کو سننے کے لئے بیٹھا کرتے تھے، ”مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ“ (۷۲:۹) سننے کے لئے بیٹھکیں اختیار کرتے تھے۔ ”فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا“ (۷۲:۹) اگر کسی نے کوئی آدھی بات سُن لی تو ایک شہابِ ثاقب اُس کا تعاقب کرتا ہے۔ ”وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا“ (۷۲:۱۰) ہم جنّات ہونے کے باوجود، ہم کو اِس بات کا علم ہرگز نہیں ہے ہم نہیں جانتے ہیں، نہیں سمجھتے ہیں کہ روئے زمین پر بسنے والوں کے متعلق خدا نے کچھ بھلائی چاہا ہے یا اُن کے لئے کوئی تکلیف مقصود ہے اِس کا ہم کو کوئی علم نہیں ہوتا۔

یہاں سے ایک بہت بڑے سوال کا جواب یہ مل گیا کہ دُنیا کے اندر آپ کو بہت سے لوگ ملیں گے جو جنّات کے توسّط سے جو رُوحوں کو بلا کر طرح طرح کے کام کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے! کوئی عجوبہ یعنی کوئی عجیب چیز وہ دکھاتے تو ہیں لیکن اصل حقیقت تک رسائی اُن کی نہیں ہوتی ہے۔ میں نے کبھی گزارش کی تھی کہ زمینِ رُوحانیت تک بہت سے لوگ جاتے ہیں لیکن زمینِ رُوحانیت پر کچھ نہیں ہے، اگر زمینِ رُوحانیت پر اللہ کے خزانے ہوتے، تو خداوندِ عالم نے حفاظت کا جو کچھ اہتمام و اِنصرام کیا ہے وہ زمینِ رُوحانیت پر ہی ہوتا اور آسمانِ یکم پر یہ محافظ اور یہ چوکیدار مقرّر نہ ہوتے۔ ظاہر بات ہے کہ زمینِ رُوحانیت پر کچھ معرفت نہیں ہے، کچھ بھید نہیں ہے بلکہ اُس میں گمراہی کے سامان ہیں لہٰذا خداوند بخوشی وہاں تک جانے کی اجازت دیتا ہے، یہ ہندو، یہ یہود، یہ نصاریٰ، یہ تمام مسلم اور دیگر مذاہب سب رُوحانیت کی زمین تک جا کر وہاں کے گمراہ کن عجائبات کو پاتے ہیں۔ مثلاً روشنی کا پانا، روشنی کے سمندر کو پانا، عجیب وغریب وحسین وجمیل یعنی چیزوں کا مشاہدہ کرنا اور وہ چیزیں لے کے کوئی تو ولی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، کوئی صوفی ہونے کی ڈینگیں مارتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ میں نے تو اللہ تعالیٰ کے نورِ جمال کو پایا، کوئی کہتا ہے، کہ میں فنا فی اللہ ہو گیا۔ آپ کو کتابوں میں مذاہبِ عالم میں ایسی بہت سی چیزیں ملیں گی لیکن کچھ نہیں ہے وہ کچھ نہیں ہے۔ آپ قرآن سے بڑھ کر آپ کے لئے کوئی سند نہیں ہے، قرآن سے بڑھ کر کوئی معیار نہیں ہے کہ آپ حقائق کو پرکھیں، تو میں نے قرآن ہی کی روشنی میں بتایا کہ جب تک آسمانِ رُوحانیت میں نہیں جایا جاتا تو کوئی چیز نہیں ملتی، کوئی بھید نہیں ملتا، بس شیاطین، جنّات،

انسان، مومن، کافرسب جا کر زمین رُوحانیت کو روندتے ہیں، پامال کرتے ہیں اور بس دھوکہ ہی دھوکہ ہے، سراب ہے، سراب سے مُراد کوئی مسافر دیکھتا ہے دُور آٹھ/دس میل آگے کوئی چیز چمکتی ہے اُس کو پیاس لگی ہے، خیال کرتا ہے گمان کرتا ہے، (guess) کرتا ہے کہ پانی ہے اور حالانکہ سورج غروب کی طرف جارہا تھا، کہ اُس کی کرنیں اِس طرح سے پڑیں اور کرچیں پڑیں اور جس کی وجہ سے زمین پر اُس کو پانی ہونے کا گمان ہوا، جب وہ وہاں جاتا ہے تو کچھ بھی نہیں ہے تو اِسی طرح وہ سراب ہے، اُس میں وہاں اُن کو کچھ بھی نہیں ہے۔ اِس لئے آپ مذاہبِ عالم کا جب مطالعہ کرتے ہیں تو بعض دفعہ آپ کو لگتا ہے کہ وہاں پر بہت عجیب وغریب چیزیں ہیں لیکن دراصل وہ کچھ نہیں ہیں۔ اِس لئے جنّات نے کہا ہم اگر کچھ پرواز بھی کرتے ہیں کچھ محنت بھی اُٹھاتے ہیں اور کوئی آدھی بات سُن بھی لیتے ہیں لیکن اِس کے باوجود ہم کو کوئی علم نہیں ہے کہ دُنیا والوں کے لئے کیا ارادہ کیا گیا ہے اور اللہ نے روئے زمین پر بسنے والوں کے سلسلے میں کیا چاہا ہے، ہم کو اِس کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ ''وَّاَنَّامِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا'' (۷۲:۱۱) جنّات کہتے ہیں، کہ ہم میں سے کچھ تو نیکوکار ہیں یعنی ایماندار ہیں اور کچھ اِس کے علاوہ ہیں یعنی بُرے ہیں، جس طرح کہ میں نے شروع میں گزارش کی تھی کہ جس طرح انسان کے دو گروہ ہیں اچھے اور بُرے فرمانبردار اور نافرمان اِسی طرح جنّات کے بھی دو گروہ ہیں مومن اور کافر۔ ''وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا'' (۷۲:۱۲) اور یہ کہ ہم سمجھتے تھے کہ ہم زمین میں رہ کر خدا کو ہرگز ہرا نہیں سکتے اور نہ بھاگ کر اِس کو عاجز کرسکتے ہیں، تو اللہ کی گرفت سے اُس کے قانون سے اُس کے قید سے کوئی بھاگ نہیں سکتا، خواہ وہ رُوحانیت میں ہو یا جسمانیت میں کوئی اُس کے قبضۂ قدرت سے باہر نہیں جاسکتا۔ ''وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ'' (۷۲:۱۳) وہ جنّات وضاحت کرتے ہیں کہتے کہ جب ہم نے ہدایت سنی تو ہم نے اُس پر ایمان لے آیا یعنی یہ ہدایت جو ربّ العزّت کی طرف سے آنحضرتؐ پر نازل ہوئی ہے قرآن کے عنوان سے اِس پر جنّات نے ایمان لایا اور درست ہے کہ خداوندِ عالم بھی یہی ارشاد فرماتے ہیں دُوسرے مقامات پر، کہ جنّات اور انسان دونوں گروہ کو عبادت اور معرفت کے لئے پیدا کیا گیا ہے (۵۱:۵۶) اور سورۂ رحمان میں اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام تر نعمتوں کے سلسلے میں جنّات اور انسانوں کو ایک ساتھ لیا اور اُن پر اپنی نعمتوں کا احسان جتلایا، اُن کو توجّہ دلائی اِس میں بھی جنّات اور انسان ایک ساتھ ہیں، تو اِس لئے جنّات کہتے ہیں کہ جب ہم نے ہدایت سنی یعنی قرآن تو اُس پر ہم ایمان لے آئے۔

اِس مقام پر ایک اشارہ یہ بھی کریں گے کہ اگر رسولؐ کا کام یہ تھا کہ وہ جنّ و انس دونوں گروہ کو ہدایت کرے تو اُس کے جانشین کا بھی یہی کام ہونا چاہئے کہ اُس کے جانشین کے بھی دو پہلو ہونے چاہئیں اِس معنی میں امام الانس والجن کہا جاتا ہے، امام نہ صرف انسانوں کا امام ہے بلکہ وہ جنّات کا بھی امام ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ: عليٌّ حُبُّهٗ الْجُنَّة قَسِيْمُ النَّارِ وَالْجَنَّة وَصِيُّ الْمُصْطَفٰے حَقّاً اِمَامُ الانسِ وَالْجِنَّة '' علیؑ وہ ہے جس کی محبّت ڈھال کی

حیثیت سے ہے یعنی علیؑ کی محبّت ہر قسم کی بلاؤں سے اور مشقتوں سے بچانے کے لئے ڈھال کی حیثیت سے ہے، علیؑ وہ ہے جو آتش دوزخ اور بہشت کے باغات کا تقسیم کرنے والا ہے، وہ برحق وصیِ مصطفٰی ہے اور جنّ وانس کے امامؑ ہیں تو یہ امامؑ کی شان میں فرمایا گیا ہے اور امامؑ ہی جنّ و اِنس دونوں گروہ کے امام ہیں، برحق امام ہیں اور خلاصہ یہ ہے، کہ امامؑ کی ہدایت نہ صرف انسانوں کے لئے چاہئے بلکہ جنّات کے لئے بھی امامؑ کی ہدایت کی ضرورت ہے اور امامؑ جنّ و اِنس کے دونوں کے امام ہیں۔ جنّات وانسان دونوں کے پیغمبر تھے اِسی طرح جو شخصیت حضورِ اکرمؐ کے جانشین کی حیثیت سے ہو اُس کا بھی یہ مرتبہ ہونا چاہئے، کہ اُن کے نور کی روشنی نہ صرف انسانوں کو پہنچے بلکہ جنّات تک اُن کے ہدایت کی روشنی پہنچے اِس لئے امامؑ کے بھی رسول کی طرح دو پہلو ہیں ظاہریت کا پہلو اور باطنیت کا پہلو۔ ''فَمَنْ يُّؤْمِنْ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا'' (۷۲:۱۳) اور جو شخص اپنے پروردگار پر ایمان لائے گا تو اُس کو نہ نقصان کا خوف ہے اور نہ ظلم کا۔ ''وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا'' (۷۲:۱۴) اور جو لوگ فرمانبردار ہیں وہ تو سیدھے راستے پر چلے اور رہے نافرمان تو وہ جہنم کے کُندے بنے۔ ''وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا'' (۷۲:۱۵) یہ سیدھی حکمتیں ہیں اور صاف ستھری باتیں ہیں وہ یہ کہ جنّات میں سے بھی یہی نظریہ ہے کہ جو فرمانبرادر ہیں اُن کو نجات ملے گی اور جو نافرمان ہیں وہ تو جہنم میں داخل کئے جائیں گے۔

اب یہاں جنّات کے بارے میں ہم کو یہ نتیجہ ملتا ہے کہ وہ بھی ایک مخلوق ہے وہ کچھ انسان سے قوی نہیں ہے، انسان سے زبردست نہیں ہے وہ کچھ افضل نہیں ہے بلکہ کسی مخلوق کا افضل ہونا اِس بات پر ہے کہ وہ فرمانبرداری کرے، جنّ ہو یا اِنس بس اُسکو خداوندِ عالم کی اطاعت وفرمانبرداری کرنی چاہئے، اگر اُس سے فرمانبرداری ہوتی ہے تو اُس کے لئے کوئی خوف نہیں ہے، کوئی ڈر نہیں ہے، یہ تصور ہی غلط ہے کہ جنّات انسانوں کو نقصان پہنچاتے ہیں، نقصان ایک چیونٹی بھی پہنچا سکتی ہے جبکہ اللہ چاہے اور جہاں ایک چیونٹی بھی انسان کو نقصان پہنچا سکتی ہے وہاں جنّات نقصان ضرور پہنچا سکتے ہیں تو پھر اِس میں کیا فرق ہے، پس انسان کو چاہئے کہ اللہ کی اطاعت کرے، فرمانبردار بنے، اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو سمجھے، خدا کی شناخت حاصل کرے، اپنے مقام کو حاصل کرے اور جو اللہ کا ہو جائے تو اللہ اُسی کا ہو جاتا ہے۔ ''مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللّٰهُ لَهٗ'' آپ ذرا سوچیں اِس حدیث کی طرف توجّہ دیں اور اِس کے فلسفے کو پائیں، کہ اِس کا کیا مطلب جو اللہ کا ہو جائے تو اللہ بھی اِسی کا ہو جاتا ہے۔ ویسے تو دیکھا جائے تو سب کائنات اللہ کی ہے اور اللہ سب کا ہے لیکن اِس کی کیا تخصیص ہے اور حدیث کیا چاہتی ہے؟ اِس حدیث سے کیا مُراد ہے؟ حدیث سے مُراد یہ ہے کہ جو انسان خصوصیت کے ساتھ اللہ کا ہو جائے تو اللہ بھی خصوصیت کے ساتھ اُسی کا ہو جاتا ہے، ویسے تو ربّ اور مالک سب کا ہے لیکن انسان خدا کے حضور میں اپنے لئے ایک خاص مقام تلاش کرے، تو اُس کو ایک خاص مقام ملتا ہے اور اِس میں یہ امتیاز پیدا ہو جاتا ہے

جیسا کہ یہ بندہ اُس کا خاص ترین ہے اور اللہ کی نظر ایسے بندے پر خصوصیت سے ہے۔

گویا اللہ تمام مخلوقات کو کسی حد تک نظر انداز کر کے اِسی پر خصوصی نظر رکھتا ہے، نظر انداز تو نہیں کرتا ہے لیکن اِس کو جو اختصاص حاصل ہے اُس کی نسبت سے کہا جائے تو یہ بات صحیح ہے۔ جس طرح ایک باپ ہے اُس کے بہت کچھ بچّے ہیں اور بچّے سب برابر نہیں ہوتے ہیں یہ باپ اُن سب کا ہے اور وہ بچّے اُسی ایک باپ کے ہیں اور کوئی دوسرا باپ ہے نہیں لیکن پھر بھی اُن میں کوئی ایسا ہو سکتا ہے، جو بعض دفعہ دُوسرے بچّے بھی کہیں کہ یہ باپ خصوصیت کے ساتھ اِسی کا ہے اور وہ بچّہ بھی سمجھے کہ یہ باپ خصوصیت کے ساتھ میرا ہے، یہ میرا باپ ہے اور باپ بھی کہے کہ صحیح بیٹا، صحیح بچّہ یہی ہے۔ اِس معنی میں حدیث میں ارشاد ہوا کہ: "مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللّٰهُ لَهٗ" جو دُوسروں سے الگ تھلگ ہو کر خدا کا ہو جائے تو خدا بھی خصوصیت سے اُسی ایک پر نظر رکھتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک بندۂ مومن خدا کا ہے اور خدا اُس کا ہے تو جنّات کیا کر سکتے ہیں، جنّات کیا کر سکتے ہیں؟ ہاتھی کیا کر سکتا ہے؟ شیر کیا کر سکتا ہے؟ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ انسان کو کوئی مخلوق کچھ نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اُسی ضمن میں، اُسی قطار میں جس طرح کہ کتّا نقصان پہنچا سکتا ہے، ہاتھی بھی انسان کو نقصان پہنچا سکتا ہے، گھوڑا بھی، بھیڑ بھی، بکری بھی، بلّی بھی اور چیونٹی بھی اور اِسی مقام پر جن بھی، بُری روح بھی، اِس کے سوا کچھ خصوصیت کے ساتھ نہیں! تو اِس کے لئے کیا چاہئے انسان کو تدبیر کرنی چاہئے عقل دی گئی ہے ہمّت دی گئی اور خدا سے دوستی پیدا کرے۔ خدا نے فرمایا ہے کہ تم کہو: "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" (۱۱۴:۱) لوگوں کو بطورِ تعلیم آپ کہہ دیں کہ میں اپنے ربّ کے حضور میں خود کو محفوظ کر لیتا ہوں۔ کبھی ہم نے اِس پناہ لینے کی تشریح کی تھی کہ اِس پناہ لینے کے لئے ایک قول کافی نہیں ہے، اگر ہم ہزار بار کہیں لاکھ بار کہیں: "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ" اِس سے کچھ نہیں ہوگا، یہ ایک عمل کے لئے فرمایا گیا ہے، قول کے لئے نہیں ہے، قول اگر ہے تو وہ رسمی ہے۔ جاننا چاہئے جہاں پر کہ پناہ ملتی ہے، تو ٹھیک ہے دُنیا کے اندر شر ہے۔ ظاہر میں ہے، باطن میں ہے، دن میں ہے، رات میں ہے، ہر جگہ پر بُرائی ہے اذیت ہے لیکن خود کو خدا کے حضور میں محفوظ کر لینا چاہئے یا کہ خدا کے وہاں پناہ لینی چاہئے، یہ علم سے اور عمل سے پناہ مل سکتی ہے اور جس کسی کو خداوند کے حضور میں پناہ ملی ہو اُس کے لئے کوئی ضرر نہیں ہے۔ امامؑ ہی خدا کی طرف سے پناہ گاہ ہیں یعنی جو پناہ خدا کی طرف سے ملنی چاہئے وہی پناہ امامؑ کے وسیلے سے فراہم ہو سکتی ہے، تو ہمیں چاہئے کہ خود کو امامؑ کی حفاظت گاہ میں پہنچا دیں، پناہ گیر ہو جائیں۔ آپ دنیاوی طور پر دیکھتے ہیں کہ فلاں گروہ اور فلاں شخص بھاگ کر پناہ گیر ہو گیا، بارش سے پناہ اُس وقت ملتی ہے جبکہ ہم چھپر کے نیچے آئیں، دھوپ سے پناہ اُس وقت ملتی ہے جب ہم سائے میں آئیں اور دشمن سے پناہ اُس وقت ملتی ہے کہ جب ہم کسی محفوظ اور محکم قلعے میں داخل ہو جائیں اور جس ملک میں شور و غوغا ہو یا دین کے لئے خطرہ ہو تو لوگ کیا کرتے ہیں اُس ملک کو چھوڑ کے ہجرت کر کے دُوسرے ملک میں پناہ گیر ہو جاتے ہیں۔ دیکھا ہر مقام پر آپ نے پناہ کی

مثال کہ اُس میں بھاگنا، دوڑ دھوپ کرنی اور کہیں جا چھپنا پڑتا ہے، تو اگر پہاڑ سے پتھّر گرتے ہیں تو لوگ کیا کرتے ہیں کہ کسی ایسے مضبوط پتھر کے نیچے سر چھپاتے ہیں وہ پتھّر وہ چٹان اِن کو پناہ دیتا ہے، اِسی طرح پناہ کے معنی کو سمجھ لیا جائے اور جس کسی کو پناہ ملی ہو تو اُسے کسی جنّ سے کسی بُری چیز سے کوئی ضرر نہیں۔ چونکہ پناہ کا تعلق ہے اور یہاں جنّات نے بھی کہا تھا کہ بے وقوف لوگ ہی جنّات کو پوجھ کر اور اُن کی پرستش کر کے ان سے تعاون حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ بے وقوف ہیں۔ اِس کا مقصد یہ تھا کہ اللہ ہی سے پناہ کیوں نہیں لیتے ہیں اور دُوسرا مطلب اُن کے بے وقوف ہونے کا یہ بھی تھا کہ جنّات سے کیوں ڈریں؟ ایک سے ڈرنا چاہئے تو بس، اور وہ خدا ہے۔ ''حَسْبُنَا اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَ کِیْل'' (۳:۱۷۳) اِس کافی ہونے میں تمام باتوں کے لئے وہ کافی ہے، امامؑ کے وسیلے سے اور پیغمبر کے توسّط سے خدا کافی ہے۔ اگر اِس حسبنا اللہ میں پیغمبر کو اور امام کو نظر انداز کیا ہوتا اور خدا اِن کے بغیر وہ کافی ہوتا تو پیغمبر کے آنے کی کیا ضرورت تھی اور امام کے ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ دیکھئے! کوئی بھی بیان ہو کوئی بھی صفت ہو اللہ کی اُس میں پیغمبر اور امام خود بخود ہوتے ہیں تو اللہ، پیغمبر اور امام کو اپناتے ہوئے یہ فرماتا ہے کہ حسبنا اللہ اگر پیغمبر کے بغیر اور امام کے بغیر اللہ کافی ہوتا تو خواہ مخواہ خدا نے ایک شخصیت کو اتنی اہمیت دی کہ اُس کو لوگوں پر بادشاہ کیوں مقرر کیا، اِس سے ظاہر ہے کہ حسبنا اللہ میں پیغمبر اللہ کا اپنا ہے وہ غیر نہیں ہے، یہ بات غیر کی طرف ہے اس کا اطلاق غیر پر ہوتا ہے اور غیر کو سمجھایا جاتا ہے کہ حسبنا اللہ میں اللہ کافی ہوں، اللہ چونکہ ایک (institute) ہے، اللہ چونکہ ایک ادارہ ہے، اللہ جبرائیل، میکائیل، عرش، کرسی، قلم، لوح، پیغمبر، جانشین اور اِن تمام چیزوں کی اللہ کی اللّٰہی ہے، خدا کی خدائی ہے اس کے بغیر نہیں ہے، اِس لئے وہ کافی ہے، اِس معنی میں وہ کافی ہے جب وہ کافی ہے اور یہ خدا کے نمائندے ہیں خدا کے گماشتے ہیں اور خدا کے مقرّر کردہ ہادی ہیں تو اِن کی پناہ میں آنا اللہ کی پناہ میں آنا ہے، ہمیں اِس طرح سے بات کرنی چاہئے جو کہ ہم کسی بڑے سے بڑے مجموعے میں بھی یہ بات کرسکیں اِس انداز سے ہماری یہ عادت ہونی چاہیے، ہماری (writting) بھی اِس طرح سے ہو، ہمارا بولنا بھی ایسا ہو، ہم خود کو محدود کیوں کریں کہ ہماری جو بات۔۔۔

ٹائپنگ: شناوزیر علی نظرِ ثانی: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: سورۂ تطفیف (۸۳) کی حکمتیں، نامۂ اعمال دراصل امام علیہ السّلام ہیں

کیسٹ نمبر: Q-12 تاریخ: ۲۰ ردسمبر، ۱۹۷۸ء کراچی

Click here for Audio

میری خواہش ہے کہ سورۂ تطفیف سے کچھ خاص باتیں بتادی جائیں جو کہ تیراسی (۸۳) نمبر کی سورت ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○ وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ ○ اَلَّذِيۡنَ اِذَا اكۡتَالُوۡا عَلَى النَّاسِ يَسۡتَوۡفُوۡنَ ○ وَاِذَا كَالُوۡهُمۡ اَوْ وَّزَنُوۡهُمۡ يُخۡسِرُوۡنَ (۸۳:۱۔۳)۔

اللہ تعالیٰ کا پاک ارشاد ہے، کہ ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی خرابی ہے جو اوروں سے ناپ کرلیں تو پورا پورا لیں اور جب اُن کو ناپ یا تول کر دیں تو کم دیں۔ اللہ پاک اِس ارشادِ اقدس میں لوگوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ اوّل تو دُنیاوی طور پر ناپ تول میں کمی بیشی نہ کی جائے، یہ پہلی بات ہے کہ ظاہری طور پر، مادّی طور پر ناپ تول میں، تجارت میں، لین دین میں کمی بیشی نہیں ہونی چاہئے اور اِس کے پس منظر میں اللہ تعالیٰ جاننے والوں کو یہ فرمانا چاہتا ہے، یہ حکمت سکھانا چاہتا ہے کہ اللہ کا جو قانون ہے وہ ہمیشہ سے ایک جیسا ہے، خواہ وہ زمانۂ رسول سے متعلّق کوئی بات ہو یا حضورِ اکرمؐ سے قبل کے زمانے کی کوئی بات ہو یا آنحضرتؐ کے بعد کی کوئی بات ہو، ہر حالت میں اللہ کا قانون ایک جیسا رہتا ہے اور اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہو کہ زمانۂ رسول میں، زمانۂ نبوّت میں دین کی ہدایت کامل اور مکمّل طور سے چل رہی تھی اور حضورؐ کی جسمانی رُحلت کے بعد نظامِ ہدایت میں یہ فرق آیا کہ راہِ حق کے سمجھنے میں دقت پیش آئی یا ہدایت میں کسی طرح سے کمی ہوئی یا دینِ اِسلام کی تعلیمات میں فرق آیا اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہو تو خداوندِ حکیم اپنے اِس ارشادِ اقدس میں ایسے خیالات ونظریات کی تردید کرتا ہے، یہ فرماتے ہوئے کہ ناپ تول ہمیشہ ایک طرح سے ہونا چاہئے اور دُوسرے طریقے سے نہیں ہونا چاہئے۔ جہاں خداوندِ عالم دنیاوی لین دین کے اِس طریقِ کار پر اعتراض کرتا ہے کہ کوئی لوگوں سے جب لے تو پورا پورا تول کے لے اور جب وہ لوگوں کے لئے تولے تو کم تولے، اللہ ایسے لوگوں کے لئے ہلاکت کا اعلان فرماتا ہے، کہ ”وَیۡلٌ“ خرابی کو اور ہلاکت کو کہتے ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ اِس چیز کو پسند نہیں کرتا ہے کہ کبھی کمی ہو کبھی بیشی ہو، تو جاننے والے جانتے ہیں کہ ہدایت جو رُوحانی رزق کی حیثیت سے ہے، علم جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رُوحانی روزی ہے، تو اُس میں کوئی فرق نہیں آنا چاہئے اور اِس میں یہ اشارہ بھی ہے، کہ بعض علماءِ دین کی تعلیمات کو دو طرح سے پیش کرتے ہیں اُس میں بعض دفعہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مجبوری ہے

تو اِس میں ایسا نہیں ہوگا جیسا کہ پیغمبرؐ کے زمانے میں تھا، اور اِس کے علاوہ اِس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ لوگ قیامت کے حساب کتاب کے متعلّق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہاں اللہ تعالیٰ انسانوں سے اعمال کے بارے میں پورا پورا حساب لے گا، کہ خدا اعمال کے محاسبہ کے سلسلے میں ہاتھ پاؤں سے، آنکھوں سے، کانوں سے شہادت لے گا اور اِس کے علاوہ خداوندِ عالم ایک بولتی ہوئی کتاب کو ظاہر کرے گا جو کہ وہ بولتی ہوئی کتاب انسانوں کے تمام اعمال کے بارے میں تفصیل سے گواہی پیش کرے گی۔ یہ بات وہ سمجھتے ہیں کہ صرف ایک طرف سے دُرست ہے ہم تو یہ کہتے ہیں کہ یہ بات دونوں طرف سے صحیح ہے دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور اگر حساب کتاب کے معاملے میں اللہ صرف قیامت میں اِس قدر باریکی سے حساب لے اور دُنیا میں دینی ہدایت کے سلسلے میں کمی رہے تو پھر کس طرح یہ بات دُرست ہو سکتی ہے کہ اللہ خود ایسے لوگوں پر اعتراض فرماتا ہے اور اُن کی ہلاکت بیان کرتا ہے، جو کہ لوگوں سے جب لیتے ہیں تو پورا پورا تول کے لیتے ہیں اور جب لوگوں کو دینے لگتے ہیں تو وہ اُس میں کمی کرتے ہیں، تو پھر یہ بات کس طرح سے دُرست ہو سکتی ہے کہ قیامت میں اللہ کی ایک بولنے والی کتاب ہو حساب لینے کے لئے، انسانوں کے خلاف شہادتیں پیش کرنے کے لئے، اور اللہ انسانوں کے اعضاء سے بھی شہادتیں مہیّا کرے اور دُنیا میں تعلیم کی، ہدایت کی، رہنمائی کی، دستگیری کی کمی رہے، تو یہ بات دُرست نہیں آسکتی ہے، یہاں ضرور اِس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جو بولنے والی کتاب قیامت کے دن سامنے آنے والی ہے وہی بولنے والی کتاب دُنیا میں بھی ہے اور اللہ حساب لینے کے سلسلے میں جس قدر باریکی سے کام لیتا ہے اِسی طرح دُنیا کے اندر مذہبی زندگی کے سلسلے میں ہدایت و رہنمائی میں بھی وہ باریکی سے ہدایات کا اہتمام فرماتا ہے، اِس لئے یہ کتنا اچھا تصوّر رہے اسماعیلیوں کا کہ وہ دُنیا میں امامِ حیّ و حاضر کو کتابِ ناطق کی حیثیت سے مانتے ہیں اور اِسی امامِ برحق کو قیامت کے دن بھی گواہ اور بولنے والی کتاب کے طور پر مانتے ہیں، تو قرآن کے اِس ارشاد کی روشنی میں اسماعیلیوں کا یہ تصور، اُن کا یہ نظریہ بڑا صاف ستھرا، اور بڑا منطقی لگتا ہے۔

اُس کے بعد اللہ پاک کا ارشاد ہے: ''اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّـهُـمْ مَّبْعُوْثُوْنَ'' (۸۳:۴) کیا ایسے لوگ گمان نہیں کرتے ہیں کہ وہ قیامت کے روز اُٹھائے جانے والے ہیں اُن کو زندہ کیا جائے گا اور اُن سے پوچھا جائے گا، تو اِس کے لئے دُنیا میں مذہبی طور پر جو بھی بات وہ کرتے ہیں وہ منطقی ہونی چاہیئے وہ صاف ستھری ہو اور ایسی بات پیش نہ کریں کہ جس سے خدا کے عدل و انصاف کی نفی ہوتی ہو، اُن کو ایسی بات کہنی چاہیئے، اُن کو ایسا کام کرنا چاہیئے جو قانونِ عدل کے موافق ہو ''لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ'' (۸۳:۵) اُس کو ضرور اُٹھایا جائے گا ایک بڑے دن میں۔ ''يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' (۸۳:۶) وہ دن ایسا ہے کہ اُس دن لوگ، عالموں کے پروردگار کے حضور میں کھڑے ہو جائیں گے جب وہ عالموں کا پروردگار ہے، تو اُس کے پروردگار ہونے کا یہ اشارہ ہے کہ اُس رحمٰن و رحیم نے کبھی دُنیا میں عقل کو تعلیم

سے، ہدایت سے اور ہدایت و رہنمائی سے محروم نہیں رکھا۔

''کَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِي سِجِّينٍ''(۸۳:۷)سُن رکھو کہ بدکاروں کے نامۂ اعمال سجین میں ہیں ۔ اِس میں ایک پُرحکمت تصوّر دیا گیا ہے کہ ہم مانیں گے کہ سجین جہنم کے ایک مقام کا نام ہے یا کہ سات جہنموں میں سے ایک جہنم کا نام ہے اور بدکاروں یا نافرمانوں کے نامۂ اعمال سجین میں ہیں، تو سوال یہ پیدا ہوتا کہ گنہگاروں کے اعمال نامے جہنم میں کیوں ہیں اور کس طرح سے ہیں؟ یہ ایک فکر انگیز تصوّر ہے، اِس میں سے بہت سی بنیادی باتیں ملتی ہیں کہ بدکاروں، نافرمانوں کے اعمال نامے بجائے اِس کے کہ اُن کے گلے میں ہوں، اُن کے ساتھ ہوں اُن کے اعمال نامے سجین میں ہیں، جہنم میں ہیں ۔ اِن کے اعمال نامے جہنم میں اِس معنی میں ہیں کہ گمراہوں کا جو سردار ہے وہ جہنم کا ایک حصّہ ہے اور گمراہوں کا حساب کتاب اُسی کے اندر ہوتا رہتا ہے ۔ اُس کی رُوح میں اِن کی نافرمانیوں کا حساب کتاب رہتا ہے، اُس کی جان، اُس کی رُوح گویا اُس کی بات ماننے والوں کے حساب کتاب کا دفتر ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ اِن کا وبال اُس کی گردن پر ہے اور دُوسری طرف سے کہا جائے کہ اِن کا اعمال نامہ وہ شخص ہے جس نے اِن کو گمراہ کردیا ہے، تو نافرمانوں کا اعمال نامہ بھی وہی ہے اور اِن کی جہنم بھی وہی ہے اور سجین بھی وہی ہے ۔ چونکہ اعمال نامہ ایک بولتی کتاب ہوتی ہے اور بولتی کتاب اچھی بھی ہوتی ہے اور بُری بھی ہوتی ہے، ہر اعمال نامہ اچھا نہیں ہوتا ہے مومن کا اعمال نامہ اچھا ہوتا ہے اور کافر و نافرمان کا اعمال نامہ بُرا ہوتا ہے، اِس لئے نافرمانوں کا اعمال نامہ زندہ ہے اور وہ اُن کا سردار ہے ۔

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ: ''وَمَا أَدْرَاكَ مَا سِجِّينٌ'' (۸۳:۸) سجین کیا ہے؟ اور تم کو کیا معلوم کہ سجین کیا چیز ہے ۔ ''كِتَابٌ مَّرْقُومٌ'' (۸۳:۹) ایک لکھا ہوا دفتر ہے، ایک لکھی ہوئی کتاب ہے ۔ ''وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ'' (۸۳:۱۰) بربادی ہے اُس روز جھٹلانے والوں کی، جھٹلانے والوں کی اُس روز بربادی ہے ، ہمیں جھٹلانے کی اور بربادی کی دونوں کی تھوڑی سی تشریح کرنی چاہئے، تو جھٹلانے سے یہ مُراد نہیں ہے کہ کوئی شخص خدا کو مانے اور پھر کہے کہ خدا جھوٹ بولتا ہے، پیغمبر کو مانے اور پھر کہے کہ پیغمبر کا کہنا صحیح نہیں، آخرت پر یقین رکھے اور پھر کہے کہ آخرت میں زندہ ہونا یا حساب کتاب کرلینا صحیح نہیں ہے اِس معنی میں جھٹلانا نہیں ہے ۔ حقیقت میں جھٹلانا کہتے ہیں علم تک نارسائی کو اور خدا کو نہ پہچاننے کو اور صحیح معنوں میں حقیقتوں کی تصدیق نہ کرنے کو جھٹلانا کہتے ہیں اور اِس کے برعکس تصدیق وہ ہے کہ کسی حقیقت کو بنیاد سے سمجھ لی جائے یہ تصدیق ہے ۔ جھٹلانے کو عربی میں تکذیب کہتے ہیں اور سچ ماننے کو تصدیق کہتے ہیں تو تکذیب یعنی جھٹلانا یہ ہے کہ حقیقتوں کو نہ سمجھ لیا جائے اور تصدیق یہ ہے کہ حقیقتوں کو سمجھ لیا جائے، تکذیب یہ کہ حقیقت تک رسائی نہ ہو، تصدیق یہ کہ حقیقت کو پالیا جائے اور بربادی کی وضاحت یہ ہے کہ آخرت کا برباد ہوجانا، رُوح کا برباد ہوجانا، رُوح کا آباد نہ ہونا اور عمل کا ضائع ہوجانا یہ بربادی ہے، جس طرح دُنیاوی معاملے میں کہا جاتا ہے کہ اُس کی دولت برباد ہوئی، خانہ برباد

ہوا یعنی گھر برباد ہوا اور اُس کی زندگی برباد ہوئی۔ برباد ہو جانا کہتے ہیں آباد نہ ہو جانے کو، تو جھٹلانے والوں کی مذمّت کی گئی ہے اور یہاں جھٹلانے سے مُراد یہ ہے کہ اعمال نامہ کو نہ سمجھا جائے اور آخرت کو حساب کتاب کو خدا کے قانون کو نہ سمجھا جائے یہ تکذیب ہے اور سب سے بڑی تکذیب یہ ہے کہ امام کو جھٹلایا جائے کیونکہ امامؑ خدا کی آیات میں سب سے بڑی آیت ہیں، امام نے اپنے مبارک اقوال میں فرمایا ہے یعنی مولانا علیؑ نے خطبۃ البیان میں ارشاد فرمایا ہے کہ: ائمۂ اطہار علیھم السّلام اللہ کی آیات ہیں، اللہ کی نشانیاں ہیں۔ آیات معجزات کے معنی میں بھی، نشانیوں کے معنی میں بھی آیات ہیں ائمۂ اطہار علیھم السّلام۔

"اَلَّذِیْنَ یُکَذِّبُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ○ وَمَا یُکَذِّبُ بِهٖۤ اِلَّا کُلُّ مُعْتَدٍ اَثِیْمٍ" (۸۳:۱۱۔۱۲)

"اَلَّذِیْنَ یُکَذِّبُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ"۔ جھٹلانے والے وہ ہیں جو آخرت کو جھٹلاتے ہیں چونکہ آخرت رُوحانیت ہے اور رُوحانیت کے واقعات ہیں اِس لئے آخرت کی تصدیق جب نہیں ہوتی تو تکذیب ہی ہوتی ہے، جب تصدیق نہ ہو، جب آخرت کو رُوحانیت کو، قیامت کو سمجھ نہ لیا جائے، تو اُس صورت میں تکذیب ہوتی ہے۔ "وَمَا یُکَذِّبُ بِهٖۤ اِلَّا کُلُّ مُعْتَدٍ اَثِیْمٍ" (۸۳:۱۲) اور قیامت کی تکذیب وہی لوگ کرتے ہیں جو گنہگار ہیں اور حد سے نکل جانے والے ہیں یعنی اِس گناہ سے ایسا گناہ مُراد ہے جو کہ خدا کی شناخت نہ ہونے کی وجہ سے سرزد ہوا ہو یعنی خدا اور رسول اور امام کی معرفت کا نہ ہونا یہ گنہگاروں سے سرزد ہو جاتا ہے کہ وہ خدا اور رسول اور امام کو نہیں پہچانتے ہیں۔

"اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ" (۸۳:۱۳) جب اُن پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو اُن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ تو اگلے لوگوں کے افسانے ہیں یعنی جب اللہ کے ارشادات کی حقیقتوں کو نہیں سمجھتے ہیں تو اُن کا یوں نہ سمجھنا ہی یہ کہنے کے مترادف ہے کہ اگلے زمانے کے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ "کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ" (۸۳:۱۴) اللہ فرماتا ہے کہ نہیں! نہیں! بات یہ ہے کہ یہ لوگ جو اعمال کرتے ہیں اُن کا اِن کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے، یہاں پر بھی ایک اہم نکتہ سامنے آتا ہے، کہ دُنیا کے اندر کچھ لوگوں کو دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے اور یہ زنگ بداعمالی سے بیٹھ جاتا ہے۔ اِس کا اشارہ یہ ہے کہ دُنیا میں جو مومنین ہیں اُن کے دل صاف ستھرے ہیں اور اِس میں ایک آئینے کی طرح تصوّر دیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے دل پر زنگ بیٹھ گیا ہو وہ حقیقتوں کو نہیں سمجھ پاتے ہیں اور جن کے دل صاف ستھرے ہیں وہ شکوک وشبہات سے پاک ہیں اور وہ حقیقتوں کو اور اللہ تعالیٰ کے مقاصد کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں یا یہ کہ جن کے دل پاک ہیں پاک اعمال کی وجہ سے اُن کے دلوں پر اللہ کی ہدایت کا عکس پڑتا ہے اُن کو توفیق ملتی ہے اُن کو اشارے ہوتے ہیں وہ رُوحانی علم کو پاسکتے ہیں اور اُس کی قدر و قیمت کو سمجھ سکتے ہیں، تو اللہ کا یہ فرمانا ہے کہ جو جھٹلانا ہے، جھٹلانے کی سبب بداعمالی سے ہے اور بداعمالی کے نتیجے میں اُن کے دلوں پر زنگ جو بیٹھ گیا ہے اُس کی وجہ سے وہ بات کو نہیں سمجھ سکتے ہیں۔

”کَلَّآ اِنَّـھُـمۡ عَنۡ رَّبِّھِـمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ “(۸۳:۱۵)اِن تمام باتوں کے نتیجے پر وہ لوگ قیامت کے دن اللہ کے حضور میں حاضر نہ ہوسکیں گے، اللہ سے وہ چھپے ہوئے ہوں گے یعنی اللہ کے دیدار سے اُن کو محرومی ہوگی۔ بہت اعلیٰ نکتہ ہے اور بہت ہی اِس میں حکمتیں ہیں کہ ایسے گنہگاروں لوگ جو خدا کو جھٹلاتے تھے اور حقیقت کو نہیں سمجھتے تھے وہ قیامت کے دن اللہ کے دیدار کو نہیں پاسکیں گے ”کَلَّآ اِنَّـھُـمۡ عَنۡ رَّبِّھِـمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ “ ایسا نہیں کہ وہ قیامت کے دن اللہ کے دیدار سے روک دیئے جائیں گے، مجوبون، حجاب میں ہوں گے اُن کے سامنے حجاب ہوگا پردہ ہوگا اور وہ اللہ کو دیکھ نہیں سکیں گے۔ ”ثُـمَّ اِنَّـھُـمۡ لَصَالُوا الۡجَحِیۡمِ “(۸۳:۱۶)اِس کے بعد وہ جہنم میں واصل ہوں گے، کتنا صاف۔۔۔[ثُـمَّ یُقَالُ ھٰذَا الَّـذِیۡ کُنۡتُـمۡ بِہٖ تُکَذِّبُوۡنَ ○ کَلَّآ اِنَّ کِتَابَ الۡاَبۡـرَارِ لَفِیۡ عِلِّیِّیۡنَ (۸۳:۱۷۔۱۸)]

۔۔۔بھی ہوسکتا ہے کیونکہ تاویل کے اصول میں قرآن کے اندر یہ گنجائش ہے کہ ہر لفظ کے جتنے پہلو ہیں اِن تمام پہلوؤں کو سامنے رکھا جائے اور اُن میں سے تاویل کی جائے کیونکہ زیر وزبر اور تشدید وغیرہ کا جو معاملہ ہے یہ بعد کا ہے اور قرآنی الفاظ کی وہ صورت جسے وحی کی صورت کہنی چاہیئے کچھ اِس طرح سے تھی کہ اُس میں تاویلات کی بہت سی گنجائشیں تھیں، بہر حال یہ صاف بات ہے کہ اِس موجودہ صورت میں بھی علی کا لفظ اِس میں موجود ہے اور لفظ سے بحث کرنے کے علاوہ اُس منطق کے مطابق بھی جو ہم نے ابھی ابھی جس سے بحث کی تھی کہ اگر سجین سے مراد گمراہوں کا سردار ہے۔۔۔کا مطلب ہادیٔ برحق ہے اور ہادیٔ برحق ہمارے نزدیک سب سے پہلے اور سب سے اوّل مولانا علی علیہ السّلام ہیں اور اِس ”عِلِّیِّیۡنَ “ سے ائمۂ آلِ علیؑ بھی مُراد ہوسکتے ہیں اور ”عِلِّیِّیۡنَ “ کی تاویل وہ رُوحیں بھی ہوسکتی ہیں جو علیؑ کی معرفت سے منسلک ہیں۔

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ: ”وَمَآ اَدۡرٰکَ مَا عِلِّیُّوۡنَ “(۸۳:۱۹)اور تم کو کیا معلوم کہ ”عِلِّیِّیۡنَ “ کیا ہے۔ ”کِتَابٌ مَّرۡقُوۡمٌ “(۸۳:۲۰)وہ ایک لکھا ہوا دفتر ہے، وہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے وہ ایک زندہ کتاب ہے جو رہنمائے راہِ حق ہیں۔ ”یَّشۡھَدُہُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ “(۸۳:۲۱)اِس تک مقرّب حضرات کی رسائی ہوتی ہے۔ ترجمے میں لکھا ہے کہ مقرّب فرشتے اِس کے قریب رہتے ہیں، اِس سے کوئی مطلب نہیں نکلتا ہے، اِس کا مطلب یہ ہے، کہ جس اعمال نامے کا یہاں ذکر ہے، جس نور کا یہاں ذکر ہے اُس تک رسائی دُنیا کی زندگی میں بھی ہوسکتی ہے مگر اُن لوگوں کی رسائی ہوسکتی ہے جو مقرّب ہیں جو خدا کے نزدیک ہو چکے ہیں، وہ لوگ زندگی میں بھی اِس اعمال نامے کو دیکھ سکتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ نہیں کہ قیامت کے دن لوگ اپنے اپنے اعمال نامے سے قریب ہوجائیں گے وہ تو قدرتی بات ہے۔ اللہ یہ فرمانا چاہتا ہے کہ جس نامۂ اعمال کا یہاں ذکر ہوا اور جس نامۂ اعمال کا نام ”عِلِّیِّیۡنَ “ ہے اُس تک دُنیا میں بھی خدا کے مقرّب افراد پہنچ سکتے ہیں۔

”یَّشۡھَدُہُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ “(۸۳:۲۱)۔ حاضر ہوسکتے ہیں پہنچ سکتے ہیں دُنیا میں جو مقرّب ہیں تو ہمارے

عقیدے کے مطابق ''عِلِّیِّیْنَ'' سے مراد امامِ برحق ہیں اور ائمہَ آلِ علی ہیں وہی ''عِلِّیِّیْنَ'' ہیں۔ اِس لفظ کو دو طرح سے پیش کیا گیا ہے، پہلے فرمایا گیا ہے ''عِلِّیِّیْنَ'' پھر فرمایا گیا ہے ''عِلِّیُّوْنَ''۔ ''عِلِّیُّوْنَ اور عِلِّیِّیْنَ'' انسانوں کے لئے آنے والا اسم ہے لہٰذا اِس مبارک لفظ سے ہم علی و ائمہَ آلِ علیؑ مُراد لے سکتے ہیں، وہی اپنے اپنے مُریدوں کے اعمال نامے ہیں جس طرح اِس کے مقابلے میں ہم نے کہا تھا کہ جو سجین ہیں وہ ایک زندہ انسان ہے، کہ اعمال نامے جو بنتے ہیں اُس کا دارومدار یا تو ہادیٔ برحق ہے یا وہ شخص ہے جس کو مضّل کہنا چاہیئے یعنی لوگوں کے اعمال نامے وہاں ہیں جہاں سے کہ اِن کو صحیح یا غلط ہدایت ملتی ہے وہی نامۂ اعمال کے دفتر ہیں تو جو گمراہ لوگ ہیں اُن کا دفتر اُن کو گمراہ کر دینے والا ہے اور جو ہدایت یافتہ ہیں اُن کا دفتر یا اعمال نامہ ہادیٔ برحق ہے اور جو ہادیٔ برحق ہے وہی بہشت ہے اور جو گمراہ کرنے والا ہے وہی سجین ہے، جہنم ہے۔ ''عِلِّیِّیْنَ'' کے لفظی معنی بلندی کے بھی ہو سکتے ہیں اور بے شک امامؑ مرتبت کے لحاظ سے عالی شان ہے عالی مرتبہ ہے اور پھر بہشت ہے اور دُوسری طرف سے بھی وہ حقیقت آ کر اِس سے مل جاتی ہے جس کے بارے میں ہم نے کہا تھا کہ اللہ کو چاہیئے کہ اگر وہ کل قیامت کو ایک زندہ اور بولنے والی کتاب ہم سے محاسبہ لینے کے لئے پیدا کرتا ہے، تو اُس کو چاہیئے کہ وہی کتاب دُنیا میں بھی رکھے تا کہ انصاف ہو اور ابھی ابھی بات چلی تھی جبکہ خدا نے کچھ ایسے تاجروں پر اور لین دین کرنے والوں پر اعتراض کیا تھا بلکہ اُن کی مذمّت کی تھی کہ جب وہ لوگوں سے لیتے ہیں تو زیادہ تول تول کر لیتے ہیں اور وہ جب لوگوں کو دینے لگتے ہیں تو بہت کم دیتے ہیں۔ اِس پر ہم نے کہا تھا کہ لوگوں کا یہ نظریہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے جو کہتے ہیں کہ قیامت کے دن نامۂ اعمال بولتا ہوا آئے گا یا یہ کہ اللہ ایک بولنے والی کتاب (produce) کرے گا، قیامت انسانوں سے محاسبہ کرنے کے لئے، احتساب کرنے کے لئے تو اِن پر ہم نے منطقی دلائل سے یہ ثابت کیا تھا اور کہا تھا کہ اسماعیلیوں کا نظریہ اِس سلسلے میں تو یہ ہے کہ جو کتاب نامۂ اعمال کے نام سے قیامت میں پیش آنے والی ہے وہ امامؑ ہے اور وہی بولنے والی کتاب دُنیا میں ہے، تو وہ حقیقت دُوسری طرف سے آ کر اِس ''عِلِّیِّیْنَ'' کی حقیقت سے مل جاتی ہے اور دونوں حقیقتیں باہم مل کر اور اِس موضوع پر زیادہ سے زیادہ روشنی ڈالتی ہیں۔

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ: ''اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ'' (۲۲:۸۳) نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے قیامت کے دن۔ ''عَلَی الْاَرَآئِكِ یَنْظُرُوْنَ'' (۲۳:۸۳) تختوں پر ہوں گے اور نظارہ کریں گے۔ اِس نظارہ سے دو باتیں مُراد ہیں ایک یہ کہ وہ جنّت کے نظارے کریں گے ایک یہ کہ اِس ''یَنْظُرُوْنَ'' سے یہ بھی مُراد ہے کہ وہ دُنیا کے احوال کو بھی دیکھیں گے۔ کیونکہ بعض دفعہ یہ سوال بھی سامنے آتا ہے جو پوچھنے والے پوچھتے ہیں کہ آیا یہ ممکن ہے جب دُنیا سے ہم چلے جائیں گے تو اُس وقت ہم اِس دُنیا کو بھی دیکھ سکیں گے یا کہ ہماری نگاہ صرف رُوحانیت ہی میں محدود ہوگی، وہ یہ سوال کرتے ہیں۔ اِس کے لئے جواب یہاں مہیّا کیا گیا ہے کہ: ''عَلَی الْاَرَآئِكِ یَنْظُرُوْنَ'' (۲۳:۸۳) وہ

تختوں پر بیٹھتے ہیں، تختوں سے مراتب مراد ہیں اُونچے اُونچے درجات مراد ہیں، جب وہ اُونچے اُونچے درجات پر ہوں گے تو ضرور وہ دُنیا کو اور آخرت کو کائنات کو ہر چیز کو دیکھیں گے۔ جنّت کی نعمتوں میں ایک نعمت نظارہ کرنا ہے، دیکھنا ہے اور بہشت میں جو نعمت ہے وہ لامحدود ہے، جب دُنیا میں شیطان کو یہ مہلت دی گئی ہے اور قرآن میں اِس کا ذکر ہے کہ وہ ساری کائنات کو دیکھتا ہے شیطان، تو کیا مومن جب جنّت میں ہوگا وہ دُنیا اور آخرت دونوں کو نہیں دیکھ سکے گا، دیکھ سکے گا، وہ ایک ایسے مرتبے تک پہنچ سکے گا کہ جہاں پر جانے کے بعد عقلِ کُل، نفسِ کُل، ناطق اور اساس بہتی ہوئی نہروں کی طرح کام کرنے لگیں گے۔ ''جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ'' (۷۲:۹) ایسے باغات میں مومنین داخل ہوں گے، کہ اُن باغات کے نیچے نہریں چلیں گی، نہروں سے مُراد یہی چار اصل، عقلِ کُل، نفسِ کُل، ناطق اور اساس، تو یہ مرتبے اُس بہشت میں باغ کی نہروں کی حیثیت سے جب کام کرتے ہیں اور جب مومنین عزّت کے تختوں پر ہوں گے تو لازمی بات ہے کہ وہ دیکھیں گے ہر چیز کو دیکھیں گے ہر چیز کے باطن کو دیکھیں گے۔ اِس دُنیا کے اندر ہم کو عقل و دانش کی جو گرہیں نہیں کھلتی ہیں اور جن چیزوں کے باطن میں ہم نہیں جاسکتے ہیں اور ہمارے لئے باطن، باطن ہی رہتا ہے اور ہم پر بہت سی چیزیں تاریک ہی رہتی ہیں تو یہ بات جنّت میں نہیں ہوگی۔ چونکہ وہاں کی نعمتیں علم وحکمت کی ہیں عقل و دانش کی ہیں، تو اِس لئے اللہ کے اِس ارشاد کی یہ تشریح ہے جو فرمایا گیا کہ: ''عَلَی الْاَرَآئِکِ یَنْظُرُوْنَ'' (۸۳:۲۳) وہ تختوں پر ہوں گے اور دیکھیں گے نظارہ کریں گے سے یہ نظارہ محدود نہیں ہے اِس کا مطلب لامحدود ہے کہ وہ دُنیا اور آخرت دونوں کو دیکھیں گے۔

''تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْھِھِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ'' (۸۳:۲۴) اُن کے چہروں کو تم راحت کی تازگی، اِن کے چہروں ہی سے راحت کی تازگی معلوم کرلو گے۔ یعنی جب تم اُن کو دیکھو گے تو اُن کے چہروں کی بشاشت سے معلوم ہوگا کہ اُن کو بہت سی نعمتیں دی گئی ہیں یعنی اِس کا اشارہ ہے کہ وہاں مومنین کے لئے بہت سی راحتیں اور مسرّتیں مہیا کی جائیں گی۔ ''یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ'' (۸۳:۲۵) اُن کو ایک پیالے سے شراب پلائی جائے گی جس کی مہر مشک کی ہوگی، یعنی وہاں پر اُن کو اللہ پاک کی ایسی محبّت عطا ہوگی، ایسا عشق عنایت ہوگا کہ دُنیا میں کبھی نہیں ہوا تھا ''خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ۚ وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ'' (۸۳:۲۶) اور اِس کی طرف البتہ شائقین کو رغبت کرنی چاہیئے، اللہ تعالیٰ کے اِس ارشاد کا مقصد یہ ہے، کہ اِس پر مومنین یقین رکھیں اور اِس کو چاہیں اور اپنے اندر ایک عظیم جذبہ پیدا کریں، اِس کے حصول کیلئے اِس کو حاصل کرنے کیلئے۔ ''وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِیْمٍ'' (۸۳:۲۷) اور اُس شراب میں جو اِس پانی سے ملاوٹ ہوگی وہ پانی چشمۂ تسنیم سے ہوگا اور تسنیم جنّت کے ایک چشمے کا نام ہے۔ ''عَیْنًا یَّشْرَبُ بِھَا الْمُقَرَّبُوْنَ'' (۸۳:۲۸) وہ ایک ایسا چشمہ ہے جس سے کہ صرف مقرّبین ہی پیئیں گے۔ یہ علم کے ایک عالی شان مرتبے کی طرف اشارہ ہے۔ ''اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ'' (۸۳:۲۹) بے شک جو گنہگار

مومنین سے ہنسی کیا کرتے تھے جب اُن کے پاس سے گزرتے تھے تو ان پر چشمک کرتے تھے یعنی مذاق کرتے تھے، ہنسی کرتے تھے[وَاِذَا مَرُّوۡا بِهِمۡ يَتَغَامَزُوۡنَ (۳۰:۸۳)]۔"وَاِذَا انۡقَلَبُوۡۤا اِلٰٓى اَهۡلِهِمُ انۡقَلَبُوۡا فَكِهِيۡنَ "(۳۱:۸۳)، اور جب اپنے لڑکے بالوں کی طرف لوٹ کر آتے تھے تو اتراتے ہوئے۔" وَاِذَا رَاَوۡهُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّ هٰٓؤُلَاۤءِ لَضَآلُّوۡنَ "(۳۲:۸۳)، اور جب وہ لوگ مومنین کو دیکھتے تھے تو اُن کو گمراہ قرار دیتے تھے کہتے تھے کہ یہ گمراہ ہیں۔"وَمَاۤ اُرۡسِلُوۡا عَلَيۡهِمۡ حٰفِظِيۡنَ "(۳۳:۸۳) اور خدا فرماتا ہے کہ حالانکہ اُن کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی کہ وہ مومنین پر ایسا طنز کریں کیونکہ اُن کو مومنین پر کچھ نگران بنا کر تو نہیں بھیجا تھا۔

"فَالۡيَوۡمَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنَ الۡكُفَّارِ يَضۡحَكُوۡنَ "(۳۴:۸۳) اور آج کے دن مومنین ہی کی نوبت ہے کہ وہ کفار پر مذاق کریں، ہنسی کریں۔"عَلَى الۡاَرَآئِكِ ۙ يَنۡظُرُوۡنَ "(۳۵:۸۳) یہ اشارہ ہے کہ اگر کافر ہو کہ اگرچہ کافر لوگ جہنم میں ہوں گے لیکن چونکہ مومنین عزّت کے تخت پر بیٹھ کر نظارہ کرتے ہیں اِس لئے اُن کی نگاہ سے اُن کے دشمنوں یا مخالفوں کی حالت پوشیدہ نہیں ہے وہ دیکھتے ہیں اِس لئے وہ حق رکھتے ہیں کہ اُن پر مذاق کریں اور اگرچہ بہشت میں مذاق نہیں ہے یہ ایک تصوّر ہے یہ ایک تعلیم ہے یہ ایک مثال ہے تاکہ مومنین کے دل میں اگر کوئی کدورت ہے یا رنجش ہے اُس کے متعلق یہ سمجھ رکھیں کہ اگر آج دُنیا میں اُس کو کوئی دکھ مل رہا ہے مخالفین کی طرف سے، دین کے دشمنوں کی جانب سے تو اُس کے لئے سمجھنا چاہئے کہ کل کو یہی بات اُن مخالفین کے اُوپر گزرنے والی ہے یعنی اگر آج مومن کو حقیر سمجھا جاتا ہے اُس کو کمزور سمجھا جاتا ہے، تعداد کے لحاظ سے، قوت کے لحاظ سے، اقتدار کے لحاظ سے اور کسی بھی لحاظ سے اور غلط طریقے سے لیکن اِس کے لئے کوئی بات نہیں ہے خدا خود ہی اِس کی ضمانت لیتا ہے اور کہتا ہے کہ کل کو مومن کافروں پر مذاق کرسکتا ہے ہنسی کرسکتا ہے لیکن بات یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ مثال ہو اور مومن بجائے مذاق کرنے کے خدا کے لئے شکر کرے اور خوشی محسوس کرے کیونکہ دُنیا کی زندگی اور آخرت کی زندگی میں بڑا فرق ہے کیونکہ قرآن میں یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ جب مومن بہشت میں داخل کیا جائے گا تو اُس وقت سینے کے اندر جو چیز ہے اُس کو نکالا جائے گا یعنی نفس امّارہ جس کی وجہ سے دُنیا کے اندر ہم کو رنجش ہوتی تھی اور جس کی وجہ سے ہم بہت دلگیر بھی ہو جاتے اور صبر بھی نہیں کر پاسکتے تھے بہت سی کمزوریاں اِس نفس امّارہ کی وجہ سے تھیں۔ لہٰذا بہشت میں نفس امّارہ نہیں ہوگا اور اُس وقت ہماری رُوح بدلی ہوئی ہوگی لہٰذا ہم اِس موڈ میں نہیں ہوں گے کہ ہم اپنے دشمنوں سے انتقام لیں چونکہ یہ تو مثال ہے اور اِس کے اندر جو واقعیت ہے وہ اور طرح سے ہے۔ یہ مثال حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ بے شک اُس موقع پر مومن غالب آئے گا اُس وقت مومن بہشت میں ہوگا اور دین کا جو دشمن ہے وہ ناکام رہے گا وہ موقع ایسا ہوگا کہ اگر ممکن ہوتا تو مومن ایسی ہنسی کرتا جس طرح اُس کے مخالف نے دُنیا میں اُس پر ہنسی کی تھی لیکن چونکہ وہ بہشت ہے چونکہ وہ رُوحانیت ہے چونکہ وہ ایک ایسا

موقع کہ شکر کا موقع ہے اور نعمت شناسی کا موقع ہے، لہٰذا وہ اِس طرح سے ہنسی نہیں کرے گا لیکن وہ کیفیت و حالت کچھ ایسی ہوگی جیسی کہ کامیابی کے بعد دشمن پر ہنسی کی جاتی ہے۔

''هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ'' (۳۶:۸۳) اللہ فرماتا ہے کہ اب تو کافروں کو اِن کے کئے کا پورا پورا بدلہ مل گیا، تو کافر ناشکر گزار کو کہا جاتا ہے اور کافر حقیقت کو جو چھپاتا ہے اُس کو بھی کہا جاتا ہے، اور کافر انکار کرنے والے کو بھی کہا جاتا ہے۔ اصطلاحی طور پر مشہور ہے کہ کافر، کافر سے ہے لیکن اِس لفظ کافر کا ایک پہلو یہ کہ جب ایک سادہ مومن کے سامنے کافر کا نام لیا جاتا ہے تو وہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ کافر بہت دُور ہے کیونکہ بسا اوقات یہ کافر بہت ہی قریب ہوتے ہیں اور اِس معنی میں کہ کافر کے معنی انکار کرنے کے ہیں تو انکار کرنے والے دُنیا میں بہت ہیں۔ اِس سورے میں سے کچھ باتیں جو اہم تھیں بتائی گئیں اور یہاں پر سورے کا رُکوع ختم ہو جاتا ہے یعنی خود سورہ ہی مکمّل ہو جاتا ہے اِس لئے میں یہاں پر رکتا ہوں اور اپنی گفتگو کو یا کہ وضاحتوں کو ختم کرتا ہوں اور ذرا میں کسی سوال کے لئے انتظار کرتا ہوں۔

ٹرانسکرائب: شاوزیر علی نظرِ ثانی: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علامہ نصیر الدین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُر حکمت بیان

عنوان: سورۂ دھر (۷۶:۱۔۷) سے چند بنیادی حقائق

کیسٹ نمبر: Q-13 تاریخ: جنوری ۱۹۷۹ء کراچی

Click here for Audio

سورۂ دھر سے کچھ بنیادی حقیقتیں بتانے کے لئے کوشش کی جاتی ہے کیونکہ عالمِ شیعیت میں "ھَلۡ اَتٰی"، یعنی سورۂ دھر کی بہت بڑی اہمیت اِس لئے ہے کہ یہ سورہ اہلِ بیتِ اطہار کی شان میں نازل ہوا ہے۔

"بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ هَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ حِیۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ یَکُنۡ شَیۡئًا مَّذۡکُوۡرًا" (۷۶:۱)۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اور بطورِ آگاہی کے پوچھتا ہے، بطورِ علم کے پوچھتا ہے، کہ آیا انسان پر دھر میں سے ایک وقت آچکا ہے، وہ وقت جس میں کہ انسان کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا، اور اِس آیۂ شریفہ میں بہت بنیادی حقیقتیں پوشیدہ ہیں، ایک اِس لئے کہ اِس میں دھر کا ذکر ہے۔ دھر آپ کو فلسفہ کی بڑی بڑی کتابوں میں دھر کا ذکر آئے گا۔ دھر کی اصطلاح آئے گی کہ دھر کس چیز کو کہتے ہیں اور اِن کتابوں میں سے ایک مشہور کتاب "زاد المسافرین" کی ہے جو پیر ناصرِ خسرو ق س کی معقولات کی کتاب ہے۔

معقولات سے وہ چیزیں مُراد ہیں جن کا تعلق عقل سے ہے، محسوسات کے برعکس کہ اُن کا تعلق حواسِ خمسۂ ظاہری سے ہے، انسان اپنے حواس کے ذریعے سے جن چیزوں کو محسوس کرتا ہے اُن چیزوں کا نام فلسفہ کے نزدیک محسوسات ہے اور جن چیزوں کو وہ عقلی طور، پر ذہنی طور پر پاتا ہے یا ادراک کرتا ہے تو اُن کو معقولات کہتے ہیں اور معقولات اُس علم کو بھی کہتے ہیں جس میں عقلی چیزوں سے بحث کی جاتی ہے، تو دھر ایک ایسے وقت کو کہتے ہیں کہ وہ وقت گزرنے والا نہیں ہے، وہ دائمی اور اٹل ہے۔ اِس تصوّر سے وقت کی دو قسمیں ہوئیں، ایک وہ وقت جو لازوال اور پائندہ ہے جس کو دھر کہا جاتا ہے اور ایک وہ وقت جس کو زمانۂ گزرندہ کہا جاتا ہے، گزر جانے والا وقت۔ گزر جانے والا وقت اِس کائنات کی گردش کے تحت آتا ہے یعنی آسمانوں کی حرکت سے جو ٹائم یا وقت بنتا ہے وہ گزر جانے والا وقت ہے، گزر جانے والے وقت میں ماضی، حال اور مستقبل ہوتا ہے اور جو وقتِ ناگزرندہ ہے یعنی پائیدار اور دائمی وقت اُس میں ماضی، حال اور مستقبل نہیں ہے۔ اِس کی مثال کے لئے آپ فرضی طور پر اِس کائنات کو سامنے سے ہٹائیں سورج کو، چاند کو، ستاروں کو بلکہ پوری کائنات کو جس کو فلسفے میں مکان کہا جاتا ہے تو مکان کو آپ ختم کریں۔ جیسے ہی آپ مکان کو ختم کریں گے تو زمان کا تصوّر بھی ختم ہو جائے گا کیونکہ

زمان وابستہ ہے مکان سے، اِس لئے کہ مکان کی گردش سے زمان بنتا ہے یعنی آسمانوں کی گردش سے اورسورج اور چاند کی گردش سے گو کہ اِس میں سورج کی گردش نہیں ہے، وقت اور زمانہ بنتا ہے اور اگر کائنات ختم ہوئی، سورج اور چاند بھی نہ رہا تو پھر زمان کا تصوّر ختم ہو جاتا ہے۔ اُس وقت ایک ایسے اٹل اور بغیر حرکت کے ایک زمانے کا تصوّر سامنے آتا ہے، کہ اُس میں نہ تو ماضی اور حال ہے اور نہ مستقبل، جس کو فلسفیوں نے دھر کہا اور اِسی دھر سے ایک دُوسری اصطلاح بھی بنی جو دھریہ ہے، دھریہ اُن لوگوں کو کہا جاتا ہے جو کہ کسی دھر کو سب کچھ مانتے ہیں اور خدا کی ہستی سے اُن کو قطعی انکار ہے، وہ کہتے ہیں کہ دھر ہی سب کچھ کرتا ہے انسان کو اور ہر چیز کو دھر ہی نے وجود میں لایا تو اِس قسم کے نظریہ رکھنے والوں کو دھریہ کہا جاتا ہے، اور آج کل جو لادینیت سے تعلق رکھنے والے ہیں وہ بھی ایک طرح سے دھریہ ہیں، چلئے دھریہ سے متعلق بحث اتنی سی کافی ہے اور ہمارا اصل مقصد یہ ہے کہ ہم دھر کو سمجھیں کہ وہ کس قسم کا وقت ہے جس کے متعلق ہم نے کہا کہ دھر اُس زمانِ ناگزرندہ کا نام ہے جس سے زمانہ بنتا ہے۔ آپ اِس دھر کو لازمان بھی کہہ سکتے ہیں، لازمان! جس طرح مکان کے نہ ہونے کی صورت کو لامکان کہا جاتا ہے اِسی طرح جہاں ماضی حال اور مستقبل نہیں ہے اُس کو آپ لازمان کہیئے اور لازمان کو دھر کہنا کافی ہے۔

اب ہم کسی حد تک دھر کی اصطلاح کو سمجھ گئے تو اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ آیا دھر میں سے ایک وقت انسان پر آچکا ہے جس میں کہ انسان کچھ بھی نہیں تھا یعنی اللہ ایک متوقع چیز کے بارے میں تصوّر دلاتا ہوئے، یاد دلاتے ہوئے توجّہ دلاتے ہوئے فرماتا ہے کہ دھر میں سے وہ وقت انسان پر آچکا ہے جس میں کہ انسان کچھ بھی نہیں تھا۔ اب اِس میں ذرا عقل و دانش سے سوچا جائے تو انسان کی ایک کیفیت ثابت ہو جاتی ہے، ایک ایسی کیفیت کہ اُس کا کوئی نام نہیں ہے کیونکہ خدا نے فرمایا کہ انسان پر جو پہلے ایک وقت آچکا تھا وہ ابھی پھر آیا ہے، اللہ اِس طرح سے پوچھتا ہے، اِس سے سمجھنے والا یہ سمجھ لیتا ہے کہ انسان پہلے ایک کیفیت تھا جس کو نیستی کہا گیا ہے، (nothingness) لیکن انسان پہلے جس نیستی میں تھا وہ نیستی ایسی نہیں جس طرح کہ لوگ سمجھ بیٹھیں ہیں، وہ ایک کیفیت ضرور تھی کیونکہ اِس آیۂ کریمہ سے اشارہ ملتا ہے کہ انسان پر دھر میں سے ایک وقت پہلے آچکا تھا اور وہی وقت اب دوبارہ آنے کو ہے۔

اللہ پوچھتا ہے کہ آیا وہ دھر میں سے آنے والا وقت انسان پر آیا ہے جو پہلے آچکا تھا کیونکہ قرآن میں جو حکمت کی تعلیم ہے وہ عجیب وغریب طریقوں میں ہے اور اللہ نے حکمت کے خزانوں کو قرآن کے اندر طرح طرح سے رکھے ہیں، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیفیت جس میں کہ انسان تھا اور وہ کیفیت جو بیان میں نہیں آسکتی ہے کیا تھی؟ جس کو میں نے ابھی ابھی نیستی سے تعبیر کی تو وہ کیا تھی یا نیستی کیا شئ تھی؟ جس کے متعلّق میں نے یہ اعتراض اُٹھایا کہ نیستی کو لوگ جس طرح سے سمجھ رہے ہیں وہ ایسی نہیں ہے، تو اِس سوال کا جواب بھی ہمارے بزرگانِ دین نے اپنی کتابوں میں دیا ہے مہیّا کر کے رکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ نیستی دراصل اِبداع کا نام ہے، ابداع = ا۔ب۔د۔ا۔ع، ابداع اور بحیثیتِ مجموعی کہا جائے کہ ایک ہے

عالمِ خلق، ایک ہے عالمِ امر، عالمِ امر میں جو کچھ ہے وہ عالمِ خلق کے برعکس ہے کہ اِس دُنیا میں کسی چیز کے وجود میں آنے کے لئے وقت درکار ہے لیکن اِس کے برعکس عالمِ امر میں جو کچھ ہے اُس کے ظہور کے لئے کسی مدّت کی ضرورت نہیں وہ بغیر مدّت کے کُن کے امر سے ظہور میں آتا ہے، جس کے متعلق قرآن میں جگہ جگہ ذکر ہے کہ اللہ جس چیز کو ظہور میں لانا چاہتا ہے اُس کے لئے بس کُن ہی فرماتا ہے۔ اِس ارشاد کا زیادہ سے زیادہ تعلق عالمِ امر سے ہے کیونکہ ہم نے ابھی تک یہ مشاہدہ نہیں کیا کہ دُنیا میں خدا چیزوں کو کُن کے ذریعے سے وُجود دے۔ اُس کی قدرت اگرچہ محدود نہیں ہے لیکن بحیثیتِ مجموعی ہم بات تسلیم کرتے ہیں، اِس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم نے اُس کی قدرت سے انکار کیا لیکن ہم مشاہدات کی بات کرتے ہیں، چنانچہ یہ بات صحیح ہے کہ عالمِ امر کو نیستی بھی کہا گیا ہے کیونکہ ایک طرح سے دیکھا جائے تو وہ نیستی کی طرح ہے کہ وہاں جو چیز ظہور میں آتی ہے یا جس چیز کو اللہ ظاہر فرمانا چاہتا ہے تو اُسی وقت اُسے کُن فرماتا ہے، تو یہ کسی چیز کے نیستی سے ہستی میں آنے کی طرح ہے اس لئے عالمِ امر کو نیستی کہا گیا اور وہ نیستی ہرگز نہیں جس کو نیستیٔ محض کہا جاتا ہے یعنی بالکل کوئی چیز نہ ہو۔

چلیے یہاں پر وہ سوال بھی کریں جو اِس مطلب سے پیدا ہوتا ہے، کہ آیا یہ ممکن ہے کہ خدا نے ایک ایسی کیفیت سے کُن فرمایا کہ اُس کیفیت کے اندر کوئی بھی صلاحیت نہیں تھی یعنی کہ وہ نیستیٔ محض تھی، جس کو قطعی نیستی (nothingness) کہنا چاہئے۔ آیا یہ بات صحیح ہے کہ ایسی کیفیت کی طرف مخاطب ہو کر خدا نے فرمایا کہ کُن یعنی ہو جا، اگر یہ بات صحیح ہے کہ خدا نے ایک ایسی تاریکی سے مخاطب ہو کے فرمایا کہ اُس تاریکی میں کوئی چیز نہیں تھی، کوئی صلاحیت نہیں تھی کوئی قابلیت نہیں تھی تو اُس کیفیت نے جو کچھ بھی نہیں تھی خدا کے امر کو کس طرح قبول کیا۔ عقل اِس بات کے لئے باور نہیں کرتی ہے، سو یہ بات صحیح ہے کہ بزرگانِ دین نے عالمِ امر کو نیستی قرار دیا اور وہی نیستی لازمان ہے، لامکان ہے اور وہی لازمانی کیفیت دھر ہے، تو اُسی میں جب انسان تھا تو انسان کا کوئی نام نہیں تھا۔ اِن مطالب کو سمجھنے کے لئے ہم اگر چاہیں تو صوفیائے کرام کے اقوال کی طرف بھی رُجوع کر سکتے ہیں۔ چلیئے ہم آپ کے ایک پسندیدہ صوفی کے قول کو پیش کرتے ہیں اور وہ صوفیٔ اعظم مولائے رومؒ ہیں، وہ کہتے ہیں:

من آن روز بودم کہ اسماء نہ بود   نشان از وجودِ مسمّا نہ بود

ترجمہ: میں اُس وقت تھا یا کہ اُس روز تھا جب کہ ناموں میں سے کوئی نام نہیں تھا اور چیزوں میں سے کوئی چیز نہ تھی کیونکہ۔۔۔ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک نام ایک چیز، تو اِن کا فرمانا ہے کہ میں ایک ایسے زمانے میں تھا ایک ایسے وقت میں تھا یا ایک ایسے دن میں تھا کہ اُس میں نہ تو کوئی نام تھا اور نہ کوئی چیز اسم اور مسمّا، نام بھی نہیں تھا اور چیز بھی نہیں تھی تو مولائے رُوم کا یہ قول اِس "ھَلْ اَتٰی" کے تحت ہے اِس کے علاوہ بھی اور بھی بہت سی باتیں ہیں اُس کے بعد کہتا ہے کہ:

زما شد مسمّا واسما پدید   دران روز کانجا من و ما نہ بود

ترجمہ: ہم ہی سے مسمّیٰ بھی پیدا ہوئے اور اسماء بھی ہم سے پیدا ہو گئے کیونکہ اُس وقت میں، تو، وہ، ہم ایسی باتیں نہیں تھی یعنی ہستی کی جو حقیقت تھی یا جو وحدت اور کثرت کا مسئلہ تھا وہ ایک ہی حقیقت تھی، لہٰذا اشارہ یہ ہے کہ انسان کی حقیقت اُس وقت خدا سے الگ شمار نہیں ہوتی تھی انسان کی حقیقت بھی خدا سے مل کر تھی، لہٰذا اُس صورت میں یہ سب چیزیں خدا ہی سے پیدا ہو گئیں ہم سے پیدا ہو گئیں دونوں باتیں ایک ہی ہیں، تو یہ دھر سے متعلّق جاننے کے لئے اور دھر کے گرد اگرد چکر لگانے اور اُس کے مرکز کو دیکھنے یا مشاہدہ کرنے کی مثالیں ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا بھی پوچھتا ہے کہ آیا وہ وقت انسان پر آچکا ہے گویا خود ہی جواب فرماتا ہے کہ نہیں ابھی وہ وقت نہیں آچکا ہے، کیونکہ پوچھنا دو طرح سے ہے، اِستفہامیائے اِقراریہ، اِستفہامیائے اِنکاریہ۔ ایک اقرار کے طور پر پوچھنا ہے ایک انکار کے طور پر پوچھنا ہے تو یہ اقرار کے طور پر پوچھنا ہے، تو انسان کی حقیقت کا اِس میں تذکرہ ہے اور انسان کو اُسی مقام پر جانا ہے جہاں پر کہ یہ پہلے تھا، مولائے رُومؒ نے اِس سلسلے میں بہت روشنی ڈالی ہے وہ ایک جگہ پر کہتا ہے:

مکانم لامکان باشد نشانم بی نشان باشد نہ تن باشد نہ جان باشد کہ من خود جانِ جانانم

اِس شعر میں مولائے رُومؒ نے اپنی حقیقت کو مکان اور لامکان سے بلند قرار دیا ہے، انسان جب لامکانی کیفیت میں ہوتا ہے تو اُسی کے ساتھ ساتھ وہ لازمانی کیفیت میں ہوتا ہے وہ گویا دھر میں ہوتا ہے، یہ اِس آیت کی تشریح ہے۔

اِس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: ''اِنَّا خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ اَمۡشَاجٍ ''(۲:۷۶) اللہ جلیل و جبّار فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا یعنی ماں باپ سے پیدا کیا صرف باپ سے نہیں، صرف ماں سے نہیں بلکہ ماں باپ دونوں سے پیدا کیا'' نَّبۡتَلِيۡهِ ''(۲:۷۶) ہم اُس کو آزماتے ہیں'' فَجَعَلۡنٰهُ سَمِيۡعًا بَصِيۡرًا '' (۲:۷۶) پس ہم نے اُس کو سمیع اور بصیر بنایا، سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔ اِس کی تشریح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو، انسان کی حقیقت کو عالمِ امر سے۔۔۔

[اللہ تعالیٰ فرماتا ہے] کہ میں نے انسان کو سمیع و بصیر بنایا سننے والا اور دیکھنے والا بنایا تو عقل یہ کہتی ہے کہ خدا کا بیان محدود نہیں ہوتا ہے، خدا جس چیز کی تعریف فرماتا ہے اُس تعریف کے اُوپر کا سِرا خدا کی خدائی تک پہنچتا ہے اور اُس کا نچلا سِرا عام سطح پر رہتا ہے اور خدا کے بیان سے کوئی چیز باہر نہیں رہ سکتی، یعنی یہ سماعت، بصارت ہمہ گیر ہے یعنی اُس میں انبیاء و اولیاء کے جو اوصاف ہیں، وہ جس طرح سنتے ہیں وہ جیسے دیکھتے ہیں اُس کا بھی بیان ہے۔ اِس معنی میں یہ بات صحیح ہے اور خدا کا یہ وصف ہے، صفت ہے کہ وہ انسان کو رُوحانیت کی بلندیوں پر پہنچا کر اپنے نور سے اُن کو منوّر کر کے اور اپنی صفات سے متّصف کر کے یعنی خدا کے اوصاف میں اُن کو سمیع و بصیر بناتا ہے، ہمارا عقیدہ یہ ہے اِس آیت کے سلسلے میں اور عام طور پر لوگ اِس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ خدا نے انسان کو پیدا کیا اُس کے لئے کان دیئے، آنکھ دی جس سے وہ

سنتا ہے اور دیکھتا ہے بس یہی مُراد لیتے ہیں تو اِس سے خدا کے کلام اور ایک انسان کے کلام میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ خدا کے جو الفاظ ہوتے ہیں وہ معنویّت کے لحاظ سے ہمہ گیر اور ہمہ رس ہوتے ہیں اُس میں سے کوئی بات کوئی صفت کوئی حد باہر نہیں ہوتی، اور اُن الفاظ کے معنوں کی رسائی حدِّ انتہا تک ہو جاتی ہے، تو یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا۔ ہم اِس کی تاویل اِس طرح سے بھی کرتے ہیں کہ پیغمبرؐ کی تنزیل اور امامؑ کی تاویل سے انسان کی رُوحانی تخلیق ہوتی ہے جس طرح جسمانی طور پر ماں باپ کے دو مادوں سے انسان کا جسم بنتا ہے اِسی طرح تاویل کے اعتبار سے بھی یہی ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ اور امامؑ یعنی ناطق اور اساس کی تنزیل و تاویل سے مومن کی رُوحانی تخلیق ہوتی ہے، جب اِس ذریعے سے مومن کی رُوحانی تخلیق ہوتی ہے تو پھر بے شک مومن سمیع و بصیر بن جاتا ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ: ''اِنَّا ھَدَیۡنٰہُ السَّبِیۡلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوۡرًا'' (۷۶:۳) یعنی ہم نے اُس انسان کو رستہ دکھایا اور اِس طرح سے رستہ دکھایا کہ وہ چاہے تو شکر گزار ہو سکتا ہے اور چاہے تو ناشکرا ہو سکتا ہے، یعنی دونوں حالتوں کی امکانیت اُس کے سامنے رکھی اور دونوں رستوں پر چلنے کی صلاحیت اُس کو دے دی نیکی کا رستہ بتلایا اور بدی کا رستہ بھی بتلایا اور دونوں کے نتائج و عواقب سے اُس کو آگاہ کیا، تو اِس ہدایت کا مطلب کئی طرح سے ہے۔ سب سے پہلے دینی طور پر کہ اُس نے ہر زمانے میں ہدایت کا وسیلہ مہیا رکھا اور کسی بھی پہلو سے ہدایت میں کوئی کمی نہیں رکھی یعنی پیغمبرؐ اور امامؑ کے وجودِ مبارک کے بعد ہدایت میں کوئی کمی نہیں رہتی ہے اور پھر اُس کو یہ بصیرت دی کہ وہ بُرائی کو اور بھلائی کو دونوں کو اچھی طرح سے جانتا ہے اور اُن میں فرق و امتیاز بھی کر سکتا ہے۔ اِس آیت کے اندر اختیار کا اشارہ ملتا ہے کہ اگر خداوندِ عالم نے بُرائی اور بھلائی دونوں کو برابر برابر سمجھا دیا ہے، تو یہ انسان کا اختیار ہے اور خدا نے خود بھی فرمایا کہ ہم نے اُس کو رستہ بتلایا تو اِس کے بعد وہ چاہے تو شکر گزار ہو سکتا ہے اور چاہے تو ناشکرا بھی ہو سکتا ہے۔ اگر دونوں باتوں کی امکانیت ہے اور دونوں چیزوں کی صلاحیت اُس میں برابر برابر ہے، تو پھر صحیح ہے کہ انسان کو اپنے دائرے کے اندر اختیار دیا گیا ہے۔

''اِنَّآ اَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ سَلٰسِلَ وَاَغۡلٰلًا وَّسَعِیۡرًا'' (۷۶:۴) ہم نے کافروں کے لئے زنجیریں طوق اور دہکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔ اللہ ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے کافروں کے لئے زنجیریں طوق اور دھکتی آگ تیار کر رکھی ہے، جہاں ہم زنجیر سے جو کافروں کے لئے مہیّا ہے، تقلید مُراد لے سکتے ہیں، زنجیروں سے روایت مُراد لے سکتے ہیں، اور اَغلال سے تقلید اور آگ سے جہالت مُراد لے سکتے ہیں۔ زنجیر روایات کے مشابہ ہیں، جو باطل روایات ہیں وہ اہلِ باطل کے لئے ایک ایسی زنجیر کی طرح ہیں جس میں، کہ اہلِ باطل جکڑے ہوئے ہیں۔ جس طرح کسی مجرم کو زنجیروں میں باندھ لیا جاتا ہے اِسی طرح اہلِ باطل کے لئے یہ سزا ہے، کہ وہ غلط روایات کے سلسلے میں جکڑے ہوئے ہیں اور اَغلال سے غُل مُراد ہے، غُل زمانۂ قدیم میں ایک چیز ہوا کرتی تھی جو کہ مجرموں کی گردن میں ڈالتے تھے۔ آپ نے کسی ڈکشنری میں، کسی بڑی

لغت میں شاید دیکھا ہو، ہم اپنے علاقے میں اِس کوغُل کوغُن کہتے ہیں لیکن یہ غُن پاؤں میں پڑتا تھا اور میری ریسرچ کے مطابق غُن غُل سے ہے اور اَغلال غُل کی جمع ہے، غُل گردن میں پڑنے کی چیز ہے، لکڑی کا ایک تختہ یا لوہے کا تختہ کسی طرح گردن میں ڈالتے تھے درمیان میں گردن کے لئے جگہ ہوتی تھی، نہ معلوم اُس میں تالا لگاتے تھے اور مجرموں کو اِس طرح رکھتے تھے کہ وہ گردن کو اُونچے کیئے رہتے تھے، وہ آرام سے جھک نہیں سکتے تھے یہ زمانہ قدیم کی سزا تھی مجرموں کے لئے، تو یہ غُل جس کی جمع اَغلال ہے اور تاویل کے اعتبار سے تقلید جس چیز کو کہتے ہیں وہی تقلید غُل ہے، تقلید کا کیا مطلب؟ تقلید جس طرح کہتے ہیں کورانہ تقلید اندھے پنے کے ساتھ کسی کی پیروی کرنا، بلا تحقیق، بلا معرفت، بلا علم کسی کے پیچھے چلنا اور یہ تقلید (literal meaning) میں قلد سے ہے، جانور کے گلے میں کوئی پٹا باندھا جاتا ہے اِس کو تقلید کہتے ہیں خواہ وہ کُتا ہے یا گائے ہے یا بھیڑ/بکری ہے اُس کے گلے میں کوئی پٹا ہوتا ہے اور اُس پٹے میں رسّی ڈال کے لوگ اُس کو کھینچتے ہیں تو یہ تقلید اِسی معنی میں ہے اور اِس کی مثال ہے جیسے کوئی کسی جانور کی گردن میں رسّی باندھے اپنے پیچھے پیچھے کھینچتا ہے تو وہ جانور اُس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے اور نہ چلے تو کیا کرے اُس کی گردن میں پٹا ہے پٹے میں رسّی ہے تو تقلید اِسی چیز کا نام ہے۔ تقلید کا ایک اچھا پہلو بھی ہے ضرور، اگر خوش قسمتی سے کوئی انسان حقیقت کی تقلید کرتا ہے تو عنقریب وہ تحقیق کرے گا اور اُس پر حقیقت روشن ہو جائے گی اور اگر بد قسمتی سے کوئی انسان کسی نادان کے پیچھے پیچھے چلتا ہے تو یہ اُس کی بد قسمتی ہے لہٰذا دانا کے پیچھے جائیں، رہبرِ حق کے پیچھے جائیں، تو اِس کا نتیجہ بہت عمدہ ہے کہ اُس کو حقیقت ملنے والی ہے اور اگر باطل پیشوا کے پیچھے چلے تو یہ بالکل تقلید ہے جو دُرست نہیں ہے۔ اِس لئے بزرگانِ دین نے کہا ہے کہ اگر شروع میں بچپن میں کچھ باتیں ایسی ہوں کہ آپ نے تقلیداً اُن کی پیروی کی ہے تو آپ جب عقل و شعور کی حد میں آتے ہیں تو اُس پر تحقیق کریں۔

بہرحال یہاں جو غُل کا ذکر ہے اَغلال کا ذکر ہے اُس سے مراد تقلید ہے اور تقلید کی مذمّت کی گئی ہے اور بے شک جو دُنیا میں اہلِ باطل ہیں اور جن لوگوں کا نظریہ صحیح نہیں ہے غلط ہے یا جن کو کفّار کہا جاتا ہے تو اُن کے کافر ہونے کا سبب یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ کسی غلط روایت کو اپناتے ہیں اور روایات کے سلسلے میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں اور پھر تقلید کرتے ہیں کچھ اگلے جو اُن کے غلط رہنما ہوتے ہیں باطل رہنما ہوتے ہیں اُن کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں، تو یہ اُن کے لئے زنجیروں کی طرح ہے اور غُل کی طرح ہے، خدا نے اِن کی صورتِ حال کا ذکر کیا اور جہالت کی تشبیہہ آگ سے اِس لئے دی جاتی ہے کہ جہالت و نادانی خود آتشِ دوزخ ہے۔ آپ کو میں یہاں عذاب کی بھی تھوڑی تشریح کروں کہ قرآن میں جہنم کے عذاب کا ذکر ہے اور کبھی تو کہا گیا ہے کہ: عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲:۱۰) یا کہ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۲:۷)، دردناک عذاب یا کہ بڑا عذاب اِس سے کیا مراد ہے؟ دیکھئے انسان کے اندر کم سے کم تین چیزیں ہیں، انسان جسم رکھتا ہے اور اِس کے اُوپر رُوح ہے اور اِس کے اُوپر عقل ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس عذاب کا اسلام میں قرآن میں ذکر آیا ہے وہ عذاب جسمانی ہے یا رُوحانی

ہے یا عقلی ہے، کون سا عذاب بڑا ہے؟ میں تو یہ کہوں گا کہ سب سے بڑا عذاب عقلی ہے پھر رُوحانی ہے اُس کے بعد جسمانی کیونکہ انسان کی ہستی میں جو سب سے بڑی چیز ہے وہ عقل ہے۔ لہٰذا عقلی عذاب سب سے بڑا ہے اُس کے بعد رُوحانی عذاب اور اُس کے بعد جسمانی عذاب۔ اگر آگ ہے اور بڑی آگ کا ذکر ہے، تو وہ عقلی آگ ہے اور عقلی آگ جہالت و نادانی ہے جس میں کہ عقل جھلس جاتی ہے یعنی جس پر نادانی مسلّط کی گئی ہے وہ آتشِ دوزخ میں ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم ہی نے زنجیریں اور طوق یعنی غُل اور آگ تیار کر رکھی ہے، یہ بات خدا کی شان سے دُور ہے کہ وہ لوگوں سے انتقام لینے کے لئے ایسی چیزیں مہیا کرے، میں تو یہ کہتا ہوں کہ لوگ ہی اپنے لئے یہ چیزیں تیار کرتے ہیں جہالت خود پیدا کرتے ہیں، زنجیریں خود بناتے ہیں، طوق خود پہنتے ہیں، غلط روایات جن کو یہاں زنجیروں سے تشبیہہ دی گئی ہے خود ہی اپنا لیتے ہیں، تقلید جس کو یہاں طوق کہا گیا خود ہی اختیار کرتے ہیں اور نادانی جس کو یہاں آگ سے تشبیہہ دی گئی ہے خود ہی اپنے لئے پیدا کرتے ہیں خود ہی اُسی کو پاتے ہیں۔

پھر آپ سوال کریں گے کہ خدا نے پھر اِس فعل کو کیوں اپنا لیا، میں نے کبھی کسی مجلس میں اِس کا ذکر کیا تھا کہ خدا جو بادشاہ ہے نیکی اور بدی دونوں کا دوزخ اور بہشت دونوں کا اور ہر چیز کا بادشاہ ہے، تو خدا کسی بھی فعل کو اپنا سکتا ہے اِس معنی میں کہ اُس کی بادشاہی میں قانون کے تحت اُس کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت ہر چیز وُجود میں آتی ہے، اُسی کی بادشاہی میں یہ ہوتا ہے بغیر اس کے کہ وہ موردِ الزام ٹھہرائے، اُس پر کسی الزام کے آنے کے بغیر وہ فعل کو اپنا سکتا ہے۔

''تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِىْ مَنْ تَشَآءُ ؕ'' (۷:۱۵۵) خدا جس کو چاہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس جو چاہے ہدایت دے دیتا ہے، تو کیا اِس سے شیطان کا جو نظریہ ہے وہ باطل ہو گیا، جو شیطان مضّل تھا یا نعوذ باللہ خدا شیطان کے فعل میں شریک ہو گیا، نہیں! شیطان ایک منظّم قانون کے تحت کام کرتا ہے تو اِس کا الزام جب شیطان تک نہیں پہنچتا ہے، آپ قرآن کے فلسفے کو دیکھیں قیامت کے دن شیطان کہنے لگے گا اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہ میں نے صرف ایک آواز دی تھی کچھ اُن کے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے رستے کی طرف نہیں کھینچا تھا، انہوں نے میری آواز کو لبّیک کہا وہ خود گمراہ ہو گئے، میں نے کہاں اُن کو گمراہ کیا! میں تو درمیان میں ایسا ہی تھا جو کچھ کرنا تھا انہوں نے کیا۔ جب شیطان اپنے فعل کی صفائی پیش کرتا ہے اور یہ بیان اللہ کی زبانِ قدرت سے ہوا ہے، تو پھر گمراہ کر دینے کا جو الزام ہے وہ خدا تک کہاں پہنچ سکتا ہے، یہ تو بالکل شیطان سے بھی نیچے اِس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ شیطان ہے ٹھیک ہے! وہ محض ایک دعوت ہے تو جس انسان کو خدا نے نیکی اور بدی دونوں کے رستے کا انجام بتایا تھا، اُن دونوں کے نتائج و عواقب سے اُس کو آگاہ کیا تھا، اُس شخص کو شیطان نے دعوت دی پھر ہادیٔ برحق نے دعوت دی، دونوں میں سے جس کو قبول کیا اُسکو اُس نے قبول کیا، اب شیطان پر اِس کا کوئی الزام نہیں ہے، تو اِس بیان سے یہ واضح ہو گیا کہ انسان کو اللہ نے اختیار دیا ہے اِسی اختیار کو بروئے کار لاتے ہوئے یا

جنّت بنا سکتا ہے یا دوزخ بنا سکتا ہے لیکن انسان جب اپنے اعمال سے جنّت بنا ہے تو ادب کا یہ تقاضا ہے کہ وہ پھر اُس کو منسوب کرے خدا سے، پروردگار سے منسوب کرے بناتا انسان ہے لیکن ادب بھی ہے، تمیز بھی ہے، عاجزی بھی ہے تو اِس کا تقاضا ہے کہ نیکی کو ادب کے طور پر خدا سے منسوب کیا جاتا ہے اور اگر حقیقت کو دیکھا جائے تو نیکی اور بدی دونوں کو خدا نے برابر برابر رکھا ہے۔ اب دونوں کام انسان خود ہی کرتا ہے، تو میں نے اِس تاویل کو تقویت دینے کے لئے یہ بات کی کہ انسان خود ہی اپنے لئے زنجیریں بناتا ہے خود ہی اپنے لئے طوق بناتا ہے خود ہی اپنے لئے آگ جلاتا ہے۔

"اِنَّ الۡاَبۡرَارَ یَشۡرَبُوۡنَ مِنۡ کَاۡسٍ "(۵:۷۶) بے شک نیکو کارلوگ شراب کے وہ ساغر پیئیں گے "مِنۡ کَاۡسٍ کَانَ مِزَاجُهَا کَافُوۡرًا"(۵:۷۶) بے شک نیکو کارلوگ شراب کے وہ ساغر پیئیں گے جس میں کہ کافور کی آمیزش ہوگی۔"اِنَّ الۡاَبۡرَارَ یَشۡرَبُوۡنَ مِنۡ کَاۡسٍ" بے شک نیکو کارلوگ شراب کے وہ ساغر پیئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی، تو یہاں پر نیکو کاروں کا ذکر ہے اور شراب سے پیغمبرؐ اور امامؑ کی محبّت مُراد ہے یا یوں کہنا چاہیئے کہ خدا و رسولؐ اور امامؑ کی محبّت مُراد ہے اور کافور سے نورِ ایمان مُراد ہے۔

"عَیۡنًا یَّشۡرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوۡنَهَا تَفۡجِیۡرًا"(۶:۷۶) ایک ایسا چشمہ ہے جنّت میں جس سے کہ خدا کے خاص بندے پیئیں گے اور وہ چشمہ ایسا رسا ہے، پہنچنے والا ہے کہ جس سمت کو وہ چاہیں اور جہاں چاہیں اُس کو وہ بہا لے جاسکیں گے۔ یہ اُس رُوحانی علم کی طرف اشارہ ہے اور اُس تائیدی علم کی طرف اشارہ ہے، کہ وہ تائیدی علم مومنین کو ہر مقام پر پہنچتا رہتا ہے اور اُس میں جسمانی بُعد یعنی جسمانی دُوری کا کوئی فرق نہیں ہوتا، امامؑ کی ہدایت اور امام کا علم ایک ایسے بہشت کے چشمے کی طرح ہے کہ وہ چشمہ ہر بہشتی کے مکان کو پہنچ سکتا ہے، یہ امامؑ کے رُوحانی علم کا ذکر ہے۔

"یُوۡفُوۡنَ بِالنَّذۡرِ وَیَخَافُوۡنَ یَوۡمًا کَانَ شَرُّهٗ مُسۡتَطِیۡرًا"(۷:۷۶) یہ لوگ اپنی نذریں پوری کرتے ہیں اور اُس دن سے جس کی سختی ہر طرف پھیلی ہوگی ڈرتے ہیں۔ یہاں پر اس کے دُہرے معنی ہیں ایک معنی اِس کے یہ ہیں کہ عام طور پر مومن جو نذر مانتا ہے اُس کو پوری کرنی چاہیئے یعنی وہ جب نیّت کرتا ہے کہ میں فلان نیکی کروں گا یا ایسی عبادت کروں گا یا ذکر کی شرط کو پوری کروں گا یا امامؑ کے سامنے جو وہ قول دیتا ہے بڑے کام کے سلسلے میں یا کسی بھی خدمت کے بارے میں وہ خود کو پیش کرتا ہے وہ ایک طرح سے نذر ماننے کی طرح ہے یا یوں کہنا چاہیئے، کہ عام طور پر مومن جو امامؑ کے نمائندے کی بیعت کرتا ہے، تو اُس بیعت میں اپنی جان کو امامؑ کے نمائندے کے ہاتھ پر فروخت کر دیتا ہے اور ہر قسم کی تابعداری اور خدمت گزاری کے لئے عہد، عہد و پیمان کرتا ہے تو اُس کو پورا۔۔۔

ٹائپنگ: شناوزیرعلی نظرِ ثانی: اکبرعلی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق) کا پُرحکمت بیان

عنوان: تسخیرِ کائنات۔خدا کی نشانیاں

کیسٹ نمبر: Q-14　　　تاریخ: فروری ۱۹۷۹ء کراچی

Click here for Audio

آج، خیال ہے کہ ہم تسخیرِ کائنات کے سلسلے میں کچھ بات چیت کریں، گو کہ کلاس قرآنی تعلیم کے سلسلے میں ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا یہ موضوع بھی قرآن سے باہر نہیں ہے، کیونکہ قرآنِ مقدّس میں تسخیرِ کائنات سے متعلق بہت سی آیات وارد ہوئی ہیں اور ویسے بھی تسخیرِ کائنات آج کل کا موضوع ہے، جس کے متعلق سائنسی نقطۂ نگاہ سے بھی کچھ اہم باتیں سامنے آسکتی ہیں اور کچھ مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ تسخیرِ کائنات ایک ایسا موضوع ہے جو کہ نہ صرف رُوحانی اور مذہبی طور پر اِس کی اہمیت ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ مادّی اور سائنسی لحاظ سے بھی اِس کی بہت بڑی اہمیت ہے، اور حقیقت میں دیکھا جائے تو تسخیرِ کائنات کا موضوع بڑا دلچسپ اور بہت ہی مفید بھی ہے۔ آپ کو قرآنِ حکیم میں ایسی بہت سی آیتیں ملیں گی جن سے یہ اخذ کیا جا سکے گا، کہ خدا کی خدائی میں، خدا کی بادشاہی میں جو کچھ بھی ہے وہ انسان ہی کے لئے ہے، خداوندِ عالم نے اپنی قدرت سے ہر ہر چیز انسان ہی کے لئے بنائی ہے، کیونکہ وہ ذات ہر چیز سے بے نیاز ہے، اسے کسی چیز کی کوئی حاجت نہیں، وہ غنی ہے، وہ صمد ہے، اُس کی حقیقت ہمیشہ سے ایک جیسی ہے، اور اُس حقیقت میں کوئی کمی نہیں، اُس میں نہ تو کوئی کمی واقع ہو سکتی ہے، نہ کوئی بیشی، وہ ہمیشہ سے ایک حال میں قائم ہے، لہٰذا اُس کے لئے کسی بھی شیٔ کی حاجت نہیں، اور کائنات کے ظاہر و باطن میں جو کچھ موجود ہے، جو کچھ پیدا کیا گیا ہے، اور جو کچھ آئندہ وجود میں آنے والا ہے وہ سب صرف انسان ہی کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مقدّس کی واضح آیتوں میں یہ تصوّر دیا ہے، کہ انسان نے زبانِ حال سے جو کچھ طلب کیا تھا وہ سب اللہ نے اسے دے رکھا ہے، چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوا ہے کہ: ”وَاٰتٰىكُمۡ مِّنۡ كُلِّ مَا سَاَلۡتُمُوۡهُ“ (۱۴:۳۴) ”اور اللہ نے وہ سب کچھ تمہیں دے رکھا ہے جو تم نے اُس سے مانگا تھا“۔

اب ہم یہاں خدا سے مانگنے کے بارے میں تھوڑی سی وضاحت کرتے ہیں، کہ اُس سے مانگنے کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ ہم اپنی زبانِ قال سے یعنی اِس بولنے والی زبان سے مانگتے ہیں، اور دوسرا یہ کہ ہم زبانِ حال سے کوئی شیٔ طلب کرتے ہیں، اور زبانِ حال سے کسی چیز کے مانگنے کے معنی یہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ خود ہماری حالت و کیفیت کے پیشِ نظر جو

کچھ دینا چاہیئے وہ دے دیتا ہے۔ اِس میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ہر چیز کی قدر و قیمت کو سمجھ کر مانگیں، کیونکہ کیا معلوم کہ خدا کی خدائی میں کیا کیا نعمتیں موجود ہیں، ہم کو اُس کا علم نہیں ہے، لہٰذا خدا کی رحمت کو چاہیئے کہ وہ خود ہماری حالت اور ہماری محتاجی کو دیکھ کر وہ ساری چیزیں ہمیں عطا کرے، جن کی ہمیں ضرورت ہے، لیکن ہاں اِس میں شرطِ فرمانبرداری اور شرطِ انسانیت بھی ہے، اِس کے یہ معنی ہوئے کہ اگر ہم اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالائیں، تو خداوندِ عالم وہ ساری نعمتیں ہمیں عطا کرے گا، جو اُس کی خدائی میں موجود ہیں۔

اب ہم آگے چلتے ہیں، کہ تسخیرِ کائنات کے بارے میں کچھ مزید وضاحت کریں اور وہ یہ کہ تسخیرِ کائنات کے دو پہلو ہیں، ایک پہلو ظاہری اور سائنسی ہے اور دُوسرا پہلو باطنی اور رُوحانی ہے، چنانچہ اِس سے انکار نہیں کہ سائنس بھی اللہ تعالیٰ کی ظاہری نعمت ہے، ایک انسانی صلاحیت ہے، جس کے مطابق انسان ہمیشہ سے تسخیرِ کائنات کے سلسلے میں جدوجہد کرتے چلا آیا ہے، تاہم اِس سے کوئی دانشمند انکار نہیں کر سکے گا، کہ طاقت کا اصل سرچشمہ رُوح اور رُوحانیت ہے۔ چنانچہ میرا اپنا عقیدہ اِس سلسلے میں یہ ہے، کہ جیسے جیسے انسان کے ذہن میں تسخیرِ کائنات سے متعلق نئے سے نئے خیالات آتے رہیں گے، اور اُن کو عملی شکل دینے کے لئے کوشش بھی جاری رہے گی، لیکن ایسی خواہشات کی تکمیل رُوحانی طور سے ہو سکتی ہے۔ اِس میں میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سائنس کی کوشش ایک طلب کی حیثیت سے ہے، ایک خواہش کے طور پر ہے اور یہ رُوحانی طور سے پوری ہو سکتی ہے۔

اِس مقام پر ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں، وہ یہ کہ ہمارے امامِ حیؔ و حاضر نے اب سے بہت پہلے ارشاد فرمایا تھا جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آنے والا ہے کہ اِس میں انسان ایک کپ چائے پینے کے لئے چاند کی دُنیا میں چلا جائے گا [۲۶ رستمبر ر ۱۹۵۹، نیروبی کینیا]۔ اب ہمیں اِس مقام پر اچھی طرح سے سوچنا چاہیئے، اِس کا تصوّر کرنا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے سائنس کے اعتبار سے بھی اور رُوحانیت کے لحاظ سے بھی کہ امامؑ کا اشارہ اِس ارشاد میں کس چیز کی طرف زیادہ ہے، سائنس کی طرف یا رُوحانیت کی طرف، اگرچہ فی الحال اِس سلسلے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے، تاہم عقیدہ اور مذہب کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بات زیادہ سے زیادہ رُوحانی طور پر ممکن ہے۔ اِس لئے کہ اگر ہم اِس معاملے میں صرف دنیاوی طور پر سوچیں تو یہ بات بہت ہی عجیب ہوگی، کہ انسان صرف ایک کپ چائے پینے کے لئے سیارۂ زمین سے چاند کی دُنیا میں چلا جائے، اور ہمیں اِس مقام پر سوچنا صحیح ہے، کیونکہ امامؑ جو کچھ بھی ارشاد فرماتا ہے اُس میں بہت سے بھید ہوا کرتے ہیں، لہٰذا ہمارا یہ تصوّر زیادہ صحیح ہے کہ انسان سیارۂ زمین سے کسی دُوسرے سیّارے میں رُوحانی طاقت سے بآسانی منتقل ہو جائے گا۔ اب اِس مقام پر میں مزید وضاحت کرتے ہوئے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ رُوحانیت میں آنے جانے کا سوال ہے نہیں، اُس میں صرف ارادہ ہی کیا جاتا ہے، اور ارادے ہی سے ایک سیّارے سے دوسرے سیّارے میں جایا جا

سکتا ہے، جس طرح موجودہ وقت میں بھی آپ اگر چاہیں تو خود کو ارادہ اور خیال ہی کے ذریعے سے کسی دُور شہر میں پہنچا سکتے ہیں، یا یہ کہ وہ شہر اور وہ مقام اپنے ذہن وتصوّر میں آناً فاناً لاسکتے ہیں، دونوں باتیں برابر ہیں۔ آپ کسی دُور شہر میں ارادے ہی ارادے سے پہنچ جاتے ہیں یا کہ اُس شہر کو اپنے ذہن میں لاتے ہیں، یہ رُوحانی سفر کی ایک عمدہ مثال ہے، کیونکہ رُوح بسیط ہے، ایک ہی انسان کی رُوح پہلے ہی سے کائنات کے گوشہ گوشہ میں موجود ہے، تو پھر رُوحانی طور پر ہمیں یہاں پر کسی سیّارے میں منتقل ہوجانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جب کہ ہم پہلے ہی سے وہاں پر موجود ہیں، صرف اتنا ہے کہ ہم اپنے ارادے کو اُس طرف مبذول کریں گے، اپنے خیال کو بھیجیں گے یا کہ تصوّر کے وسیلے سے اُس مقام کو اپنے دل ودماغ میں لائیں گے۔

آج کل جو سائنس کی ترقّی کا عروج ہے ایسی، ایسی باتوں کے بارے میں سوچ رہے ہیں، لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ سائنس کا اس طرح سوچنا بھی خدا کے حضور میں ایک طلب کی حیثیت رکھتا ہے، ایک (demand) ہے، ایک مطالبہ ہے، جو آگے چل کر رُوحانی طور پر یہ طلب منظور ہوگی، یعنی وہ سائنسدان اب (dissolving system) سے تسخیرِ کائنات یا کہ خلا نوازی یا کہ ایک سیّارے سے دوسرے سیّارے میں پہنچنے کے لئے سوچ رہے ہیں، وہ (dissolving system) کیا ہے وہ تو سائنس کے کافی مطالعے کے بعد بتایا جاسکتا ہے لیکن فی الحال ہمارے ذہن میں اِس بارے میں جو بات آئی ہے وہ یہ ہے، کہ انسان کسی چیز کو یا انسان کے ذہن کو کسی دُور سیّارے میں پیدا کرے، وہاں پر جو پہلے سے ایتھر موجود ہے یا جو رُوح موجود ہے یا جو کائناتی طاقتیں موجود ہیں اُن کے وسیلے سے، یہاں سے وہاں کوئی ایسی چیز اِس طرح سے منتقل کردی جائے، کہ اُس چیز کو یہاں سے بھیجنے کی ضرورت ہی نہ ہو بلکہ وہی چیز وہاں پیدا ہوجائے، یہ رُوحانیت کا ایک تصوّر ہے اور رُوحانی طور پر یہ بات بہت ممکن ہے۔ دُوسری بات جو اہم ہے وہ یہ ہے کہ اب جو دُنیا والوں کو خواہشات پیدا ہو رہی ہیں اور وہ جن چیزوں کے لئے سوچتے ہیں وہ مومنین کو عالمِ رُوحانیت میں خود از خود حاصل ہوجائیں گی۔ سائنس کی دُنیا میں جو سوالات پیدا ہوجاتے ہیں یا جن چیزوں کے لئے سوچا جاتا ہے، خواہ وہ چیزیں پوری ہو جائیں یا ادھوری رہیں لیکن خدا کے حضور میں انسانوں کی یہ خواہش یا یہ کوشش ایک طلب اور (demand) کی حیثیت سے ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ پر یہ واجب ہوتا ہے، کہ وہ اپنے بندوں کی اِن خواہشات کو رُوحانیت کی دُنیا میں پوری کردے، اور ساتھ ہی ساتھ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اِس دُنیا میں بھی ایسی بہت سی انسان کی خواہشیں پوری ہوسکتی ہیں۔ قرآنِ مقدّس کے اندر بہشت کے بارے میں ایک ارشاد آیا ہے، اور وہ ارشاد بڑا اہم ہے اور ایسا ہے کہ جنّت کے متعلق جتنے بھی سوالات کیے جائیں اُن سب کے لئے اُس میں جواب موجود ہے۔ وہ ارشاد یہ ہے جو فرمایا جاتا ہے کہ اُن جنتیوں کے لئے وہاں پر ہر وہ چیز موجود ہے جسے وہ چاہتے ہیں (۵۰:۳۵)۔

اِس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر ایک مومن اِس دُنیا میں تسخیرِ کائنات چاہتا ہے تو عالمِ رُوحانیت میں جو بہشت ہے اِس کی یہ خواہش پوری کر دی جائے گی، اور اُس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جو چیزیں اُن کی خواہش سے بالاتر ہیں وہ بھی بہشتیوں کو عطا کر دی جائیں گی، یعنی جیسا کہ شروع میں کہا گیا تھا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان سب چیزوں کا علم رکھے اور پھر اُن کو چاہے اور اُن کے بارے میں خواہش کرے، یہ انسان سے نہیں ہوسکتا ہے، کیونکہ اُس کے علم میں نہیں ہے کہ خدا کی خدائی میں کیا کیا نعمتیں ہیں۔ اِس لئے خدا نے یہ فرمایا کہ انسان جن چیزوں کے بارے میں علم رکھتا ہے وہ بھی اُس کو عطا کر دی جائیں گی، اور جو چیزیں وہ نہیں سمجھتا ہے اُن کا علم اب تک اِس کو نہیں ہوا ہے تو وہ چیزیں بھی، انسان کو، مومن کو عطا کر دی جائیں گی۔ یہاں پر ایک اور اہم بات بتائیں جو اکثر پوچھا جاتا ہے، وہ یہ کہ اگر ایک انسان عالمِ رُوحانیت میں جانے کے بعد دُنیا میں آنا چاہتا ہے تو کیا اِس کلیّہ کے مطابق اللہ اُس کی خواہش کو پوری کرے گا؟ اِس ارشاد سے جواب ملتا ہے کہ ہاں! اُس کی یہ خواہش بھی پوری ہوگی کہ وہ دُنیا میں آسکے گا۔ دُوسرا سوال کیا یہ ممکن ہے کہ انسان بہشت میں، جو ہر چیز کے چاہنے کی جگہ ہے، یہ چاہے کہ وہ وہاں بھی رہے اور یہاں بھی آئے؟ جواب ملتا ہے کہ ہاں! یہ بھی ممکن ہے، کیونکہ انسان آج ایک نکتہ اور ایک ذرّہ جیسا نظر آتا ہے لیکن کل جب عالمِ رُوحانیت میں خود کو پائے گا تو اُس وقت اُس پر ظاہر ہوگا کہ وہ بسیط ہے یعنی ہر جگہ پر ہے۔ اِس لئے کیا مشکل ہے کہ جب یہ کُل سے وابستہ ہوجائے گا، اِس کی انا کُل سے ملے گی اور ایک کُلی انا قرار پائے گی، تو اُس وقت یہ خود کو بیک وقت دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی پائے گا، اِس کی مثال ہم امامِ زمانؑ سے لے سکتے ہیں، کیونکہ وہ تکمیلِ انسانیت کا نمونہ ہے یعنی انسانِ کامل ہے اور دُنیائے انسانیت کا وہ اعلیٰ مقام ہے جو سب سے آخر میں ملتا ہے، تو ہم دیکھتے ہیں اور تصوّر کرتے ہیں کہ امامؑ بیک وقت عالمِ جسمانیت میں بھی ہے اور عالمِ رُوحانیت میں بھی ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ کُل کائنات پر بسیط اور محیط ہے، یعنی جسم کے اعتبار سے وہ دُنیائے ظاہر میں ہے اور رُوح کی وسعتوں کے لحاظ سے آخرت اور بہشت میں ہے۔ کیونکہ اسماعیلی تعلیمات کے مطابق دُنیا اور آخرت ایک ساتھ ہے، دُنیا جسم ہے اور آخرت رُوح، اسی طرح تسخیرِ کائنات کے تصوّر کے سلسلے میں ہادیٔ برحق کے وُجودِ مبارک سے ہم مثال لے سکتے ہیں۔

وہ یہ کہ امامؑ اپنے نور کے وسیلے سے کُل کائنات پر محیط اور حاوی ہے، تو یہ ہوئی رُوحانی طور پر تسخیرِ کائنات کا ایک تصوّر، نیز اُس آیت کی تشریح جس میں کہا گیا ہے کہ تم کو بہشت میں ہر چیز عطا کر دی جائے گی، اور اگر ہم اِس حقیقت کو تسلیم کریں کہ جزو کُل کے ساتھ مل جاتا ہے تو اُس وقت تسخیرِ کائنات کا جو تصوّر ہے اُس کے مطابق عمل ہوگا، یہ ہے تسخیرِ کائنات کی ایک وضاحت کہ اصل میں تسخیر رُوحانی طور سے صحیح ہے۔ اِس کے باوجود ہم سائنس کی کوششوں سے انکار نہیں کرتے ہیں کہ وہ ایک اچھی مثال ہے اور اِس میں انسان کو مذہبی طور پر سوچنے کے لئے موقع ملتا ہے، اور یہ سبق ملتا

ہے کہ کس طرح ناممکن چیزیں ممکن ہو جاتی ہیں۔اِس سے میری مراد ہے کہ زمانۂ قدیم میں جو چیزیں ناممکن قرار دی گئی تھیں،وہ اب یا کہ اُن میں سے بہت سی چیزیں سائنس کی بدولت ممکن ہوئی ہیں،یہ ایک مثال ہے۔اِس واقعہ کے لئے کہ رُوحانی طور پر اِس سے زیادہ ممکن ہے کہ ہر چیز مسخّر ہو اور ہر ناممکن،ممکن ہو جائے۔

قرآن میں ایک اور ارشاد ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ ہم عنقریب اِس ظاہری کائنات میں اپنی نشانیاں بتائیں گے اور اُن کے نفوس میں بھی ایسی نشانیاں بتاتے رہیں گے، یہاں تک کہ وہ سمجھ پائیں کہ اللہ برحق ہے(۴۱:۵۳)۔یہ پیش گوئی اُس وقت کی ہے جبکہ قرآن نازل ہو رہا تھا،اور پیش گوئی کے طور پر فرمایا گیا تھا کہ آنے والے زمانے میں ہم ظاہری اور کائناتی طور پر بہت سی نشانیاں بتائیں گے۔اس سے سائنس کی وہ ساری ترقّی مراد ہے جو اب تک ہو چکی ہے، پھر اِس کے بعد رُوحانی ترقّی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور جس میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ انسانوں کے نفوس میں یعنی باطن میں ایسی نشانیاں بتائیں گے جو اب تک بیرونی طور پر تھیں اور اُس سے کہیں بڑھ کر، یعنی اِس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کی نشانیاں دو قسم کی ہیں،ایک تو ظاہر میں ہیں اور انسان کے نفس میں،انسان کے نفوس میں۔ظاہری نشانیاں مادّی قسم کی ہوتی ہیں اور باطنی نشانیاں رُوحانی نوعیت کی،اِس مطلب کی مزید وضاحت کروں گا اور وہ یہ کہ ایک وقت آنے والا ہے جس میں کہ انسان کے دل و دماغ میں وہ سب کچھ پیدا ہو گا جو کچھ کہ اب سائنسی طور پر سامنے ہے یعنی یہ ریڈیو، یہ ٹیلیویژن، یہ وائرلیس، یہ دُوربین اور یہ سب کچھ انسان کے ذہن کے اندر پیدا ہو جائے گا،اور جس کی بدولت انسان رُوحانی طور پر کائنات کو تسخیر کر لے گا۔

اب میں اِس سے بڑھ کر ایک بھید اِس سلسلے میں بتانا چاہتا ہوں،وہ یہ کہ جب مومن عبادت و بندگی کرتا ہے،اور رُوحانی طور پر آگے سے آگے بڑھتا ہے،اور آگے سے آگے بڑھتے ہوئے چلا جاتا ہے،تو ایک دن ایسا بھی آتا ہے جس میں کہ ساری کائنات کا خلاصہ،یعنی ساری کائنات کی رُوحیں، ذرّات یعنی ایٹم کی شکل میں مومن کے اندر داخل ہو جاتی ہیں۔تمام اشیاء کی رُوحیں، ہر چیز کی رُوح، تمام سیّاروں، ستاروں اور پوری کائنات کی ارواح، مُردوں کی بھی، زندوں کی بھی، یہ تسخیرِ کائنات ہے۔اب اُس وقت بیرونی کائنات سے کیا تعلق ہے، کائنات تو مسخّر ہوگئی، تسخیر اور مسخّر تابع ہونے کو کہتے ہیں، ذرا اِس لفظ کے معنی میں سوچا جائے، اِس سے بہتر تسخیر اور کیا ہو کہ ساری کائنات انسان کے اندر سما جاتی ہے، مولا علیؑ نے اپنے دیوان میں ارشاد فرمایا ہے کہ:''تُو گمان کرتا ہے کہ تُو ایک چھوٹا سا جسم ہے اور حالانکہ تمہارے اندر ساری کائنات سمو گئی ہے''،ہم اسماعیلیوں کو ایسے بھی تصورات دئے گئے ہیں اور ایک یہ کہ ''وَكُلَّ شَيۡءٍ اَحۡصَيۡنٰهُ فِيۡۤ اِمَامٍ مُّبِيۡنٍ'' (۳۶:۱۲) اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے تمام چیزیں امامؑ کے نور میں، اُس کی رُوحانیت میں محدود کر رکھی ہیں، گھیر کر رکھی ہیں، سمو دی ہیں، اب اگر ایک مومن امامؑ سے واصل ہو جاتا ہے، اپنے ہی مقام پر یا امامؑ اُس میں آتا ہے یا یہ امامؑ

میں جاتا ہے یاامام کا دیدار ہوتا ہے، امامؑ میں فنا ہو جاتا ہے، امام کا نور آتا ہے یا امام کا اسمِ اعظم اُس کو ملتا ہے، اور اُس کی شرطوں کو یہ پوری کرتا ہے تو کیا اُس وقت اِس آیت کے مطابق یہ تسخیرِ کائنات نہیں کر سکے گا؟ کائنات کو مسخّر نہیں کر سکے گا؟ یا وہ نور جس میں سب کچھ ہے، ساری کائنات کو لے کر نہیں آئے گا؟ یہ تسخیرِ کائنات کی دُوسری وضاحت ہے، اور اِس سے بڑھ کر کوئی شئ نہیں، ایک اور مثال میں آپ کو بتاتا ہوں، قرآن میں ہے کہ تم دوڑ پرو، مقابلہ کرو، مسابقہ کرو، نیکی میں، بھلائی میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کام کرو اور اُس جنّت کو حاصل کرو جو کہ کائنات کے برابر ہے، جس کا طول وعرض کائنات کے برابر ہے، جب کوئی دانشمند اِس میں ذرا سوچتا ہے وہ سمجھ پاتا ہے کہ اِس کا مطلب کیا ہے، اِس کا مطلب یہ ہے کہ یہی ایک نام ہے کائنات کے باطن کا۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپنگ: نجمہ بیگ نظرِ ثانی: اکبر علی پرُوف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: مشرق اور مغرب کی تاویل، انبیاؑ کے مراتب، کتابِ نور

کیسٹ نمبر: Q-15-A تاریخ: ۱۵؍دسمبر،۱۹۸۱ء کراچی

Click here for Audio

اِن کا سوال ہے کہ آیۂ نور میں جو فرمایا گیا ہے کہ درختِ زیتون نہ تو مشرق کا ہے اور نہ ہی مغرب کا ہے (۳۵:۲۴) اِس میں اِن کا سوال ہے کہ یہاں مشرق ومغرب سے کیامراد ہے؟ اور وہ اِس کے لئے چونکہ آپ عزیزوں نے نور کے موضوع کو پوری طرح سے (study) کیا ہے یا جیسا بھی کیا ہے تو ہم توقع رکھیں گے کہ آپ میں سے کوئی اِس سوال کا جواب مہیّا کرے، کوئی عزیز ہاتھ اُٹھائے جن کو اِس سوال کا جواب آتا ہو کہ ہوسکتا ہے کہ نور کے موضوع میں کہیں اِس کی تاویل بتائی گئی ہو اور کوئی عزیز۔

جواب: [ڈاکٹر رفیق جنّت علی] سر! اِس سے مرادعقلِ کُل اور نفسِ کُل آپ نے لیا ہے، سر! وہ لامکانی ہے اِس لحاظ سے نہ وہ مشرق میں ہے اور نہ مغرب میں ہے]

جواب: جی ہاں! انہوں نے صحیح کہا کہ ایک طرف سے حدود کا ذکر بھی آتا ہے اور اُس میں مشرق اور مغرب کا ذکر آتا ہے، اور پھر دُوسری طرف سے یہ بھی ہے کہ کوئی حقیقت یا کوئی درجہ جو ہے لامکانی طور پر بھی ہوتا ہے، خداوندِ عالم کبھی کسی درجے کو کسی حد کو حدودِ دین میں سے کسی حد کو مکان کے طور پر پیش کرتا ہے اور کبھی لامکانی طور پر، اِس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ درختِ زیتون جو پیغمبر اور امام کا خاندان ہے یا اُن کی شخصیت ہے وہ پورے عالمِ دین پر محیط ہے وہ مشرق کی طرف نہیں یعنی دین کے مشرق کی طرف اور دین کے مغرب کی طرف بھی نہیں بلکہ سارے اطراف پر محیط ہے اِس لئے، اور کسی روایت میں یہ بھی ہے کہ اِس سے حضرت ابراھیمؑ کا خاندان مُراد ہے کہ اُن کا تعلق نہ یہود سے ہے اور نہ نصاریٰ سے۔ بہرحال یہ بھی ایک روایت ہے، تو اِن کا یہ سوال تھا اور کسی کا کوئی سوال، جی۔

سوال: [سر! جس طرح آیۂ نور سورج کی طرح ہے، تو یہاں پر سر! سورج کی ایک بات بتائی گئی ہے، جس طرح آٹھ بہشت ہیں اور رضوان ایک ہے، جو سولہ مقامات ہیں جن کے آٹھ جوڑے ہوتے ہیں اور اسی طرح سے سورج مرکزِ دوزخ ہے تو سر سورج کو کیوں اِس طرح سے دوزخ بتایا گیا ہے؟]

جواب: سورج جو ہے کائناتی بھٹّی بتائی گئی ہے یعنی کائنات کو بنانے کے لئے جس طرح کسی کارخانے میں

کوئی (powerful) بھٹّی ہوتی ہے اسی طرح اِس کائنات کی تخلیق وتکویم کے لئے سورج جو ہے وہ ایک طرح کی بھٹّی ہے، اِس معنی میں کہا ہوگا کہ اگر سورج نہ ہوتا تو اِس کائنات میں معدنیات میں سے، نباتات میں سے اور جانوروں میں سے کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی، اِس معنی میں سورج کے چشمے کا جلنا حکمت اور فائدے سے خالی نہیں ہے، لہٰذا ہم اُس کو اِس کائنات کی بھٹّی قرار دے سکتے ہیں کہ ساری تخلیق وتقویم سورج کی بدولت ہے اور اگر لفظِ جہنم استعمال کیا گیا ہے تو وہ صرف اِس ایندھن کے لحاظ سے اور بھٹّی کے اعتبار سے ہے۔ جی ہاں! اور کوئی سوال ہے۔

سوال: [امام کا نور ہم کہتے ہیں کہ خدا کا نور ہے اور پیغمبر کا نور امام کا نور ایک ہی ہے تو کہا جاتا ہے کہ امام سے امتحان ہوتا ہے یہ امتحان کیوں کس معنی میں ہوتا ہے جبکہ وہ خدا کا نور ہے؟]

جواب: امتحان وآزمائش جس کو عربی میں بلا کہا جاتا ہے اور بلا (literal meaning) میں آزمائش کو کہا جاتا ہے تو یہ لازمی بات ہے کہ ایک شخصیت ہے اور ایک نور ہے تو یہ آزمائش شخصیت پر آتی ہے اور نور ہی کسی مصلحت وحکمت کے تحت شخصیت سے آزمائش لیتا ہے اور اچھا تو اور اچھا! وہ سوال جو آپ نے تیار کئے ہیں۔

سوال: [ڈاکٹر رفیق جنّت علی] سر! آپ نے فرمایا کہ ظاہری سورج اور چاند ہیں اُس سے اِس دنیا کے وقت کا تعین کیا جاتا ہے جبکہ دین کے سورج اور چاند ہیں اِس سے دین کے اوقات کا تعین ہوتا ہے، سر! یہ کس طرح سے ہوتا ہے؟

جواب: وہ اِس طرح سے کہ ایک جامہ بدل جاتا ہے، تو اُس حساب سے عالمِ دین میں ایک مدّت پوری ہو جاتی ہے، ایک وقت یا ایک دن یا ایک دَور بن جاتا ہے تو اِسی طرح شخصیتوں کے تبادلے سے دین کے اندر جو زمان ہیں اُس کا تعیّن ہو جاتا ہے۔ جس طرح آدمؑ ایک دن تھے نوحؑ، ابراھیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور آنحضرتؐ تو اِسی طرح ہر شخصیت یعنی پیغمبر اور امام، اماموں میں سے ہر شخصیت سے ایک خدائی وقت کا تعیّن ہو جاتا ہے اور جس طرح قرآن میں ہے کہ: ''اَلشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ بِحُسۡبَانٍ'' (۵۵:۵) سورج اور چاند جو ہے وہ ایک ہی نظام کے تحت چلتے ہیں تو بڑے دَور میں جو وقت بڑے حساب سے ناطق مقرّر کرتے ہیں وہی مثال چھوٹے دَور میں امام پیش کرتے ہیں کہ ایک بڑے [دَور] کو فارسی میں اور وجہِ دین کی اصطلاح میں دَورِ مِہین کہا گیا ہے اور چھوٹے دَور کو دَورِ کِہین کہا گیا ہے، ہم عام زبان میں اِس کو بڑا دَور اور چھوٹا دَور کہیں گے۔ اُس کی ایک مثال، جس طرح اللہ کے سات دن ہیں اور چھ دن تو چھ ناطق ہیں اور ساتواں دن جو ہے وہ قائم ہیں، تو یہ سات ہو گئے اِسی طرح چھوٹے دَور میں بھی سات دن ہیں، کہ ہر امام ایک دن کو پیش کرتا ہے، اِسی طرح سات امام دین کے ہفتے کو بناتے ہیں اور ہر ساتواں امام اِس بات کی مثال ہے جس طرح کہ بڑے دَور میں ساتویں نمبر پر قائم القیامت ہوتے ہیں اِسی طرح ہر ساتواں امام ایک طرح سے قائم القیامت ہے یا اِس مثال کو یوں کہنا چاہئے کہ پہلے امام جو ہیں وہ آدمؑ کے برابر ہیں، دوسرے امام نوحؑ کے، تیسرے امام ابراھیمؑ کے، چوتھے امام وہ موسیٰؑ

کے اور پانچویں امام وہ عیسیٰؑ ، چھٹے امام وہ آنحضرتؐ کے اور جو ساتویں امام جو ہیں وہ خود امام اور قائم القیامت کے بالمقابل ہیں اور اِسی طرح سات اماموں کا ایک (cycle) بنتا ہے، (cycle) معنی دَور اور گردش اور اِس کائنات کے اندر آپ دیکھتے ہیں کہ جو وقت کا سلسلہ بنتا ہے وہ گول چکّر میں ہے یا جس طرح لاانتہائی بنتی ہے وہ بھی گول چکّر میں ہے تو اسی طرح سلسلۂ امامت جو ہے وہ سات کے (figure) کے اندر ہے یعنی سات اماموں کا ایک (cycle) بنتا ہے اور سات اماموں کا ایک (cycle) بنتا ہے، جس طرح انسان کی تخلیق قرآن کی ایک آیت کے بموجب سات مراحل سے گزر کر مکمّل ہو جاتی ہے وہ آپ کو کتاب میں ملے گی (۲۳: ۱۲۔ ۱۴)۔ جس طرح دینِ خدا چھ شریعتوں سے اور ساتویں قائم کے دَور سے دینِ خدا مکمّل ہو جاتا ہے اسی طرح آپ کا سوال تھا کہ اگر ظاہری اور دنیاوی وقت سورج اور چاند بناتے ہیں تو عالمِ دین کا جو وقت ہے وہ کس چیز سے بنتا ہے تو اِس کا جواب دیا گیا۔ اور کوئی ایسا سوال۔

سوال: (سر! انسان دُنیا کے اندر ہوتا ہے تو اُس کی مادّی ترقّی کا دارومدار ہے وہ اُس کی محنت ہے، قوتِ ارادی کا استعمال ہے، اِس طرح سے اُس کا دنیوی مرتبہ متعیّن ہوتا ہے۔ رُوحانی درجہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو انبیاء ہیں اُن کے مختلف درجات تھے، تو یہ درجات ہیں نور تو ایک ہی ہوتا ہے، خدا کا نور ہم مانتے ہیں تو اِن کے درجات کس طریقے سے ہوتے ہیں، یہ خدا کی طرف سے مقرّر کردہ ہوتے ہیں یا اُن کی اپنی کوشش ہوتی ہے؟)

جواب: ہاں! آپ نے مراتب کے اعتبار سے / درجات کے لحاظ سے دُنیا کی مثال پیش کی اور پھر سوال دین کے بارے میں کیا اور کہا کہ دین میں جو انبیائے عظّام ہیں وہ مختلف مراتب پر فائز ہیں تو اِس کی حقیقت کیا ہے۔ یہ ہے کہ اِس میں منشائے الٰہی کارفرما ہے یعنی خدا کا ارادہ جو حکمت کے مطابق ہے کام کرتا ہے تاہم اِس میں یہ بھی ہے کہ جس طرح دُنیاوی اعتبار سے ہر وہ شخص ایک اعلیٰ مقام کو پہنچتا ہے جو محنت کرتا ہے تو اِسی طرح دین میں بھی ہے اور دین میں جو خدا کی فرمانبرداری کرے اور محنت سے کام لے جدوجہد کرے تو وہ بھی ایک درجے پر فائز ہو جاتا ہے اور پھر یہ سوال ختم ہو جاتا ہے کہ جو انبیا علیھم السّلام ہیں وہ اتنے بڑے بڑے مرتبے پر فائز ہیں، کہ دُوسرے انسانوں کو اُن کے مقام تک پہنچنا ناممکن سا لگتا ہے تو سوال یہیں سے پیدا ہوا تھا لیکن نہیں رُوحانی اعتبار سے جب ایک انسان خدا سے جا ملتا ہے، اصل سے واصل ہو جاتا ہے، معراج کے مقام تک جاتا ہے اور قرآن نے تمام امتّوں سے یہ کہا ہے کہ تم انبیاء کے نقشِ قدم پر چلو اور اِسی (sense) میں آنحضرتؐ کے قول و فعل کو اُسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے یعنی بہترین نمونہ اور بہترین نمونہ اپنے اندر یہ (sense) رکھتا ہے، کہ اِس میں مسلمانوں کو بلکہ اطاعت و فرمانبرداری کی جائے تو اہلِ جہاں کو آنحضرتؐ کے نقش قدم پر اُس اعلیٰ ترین مقام تک پہنچنا ممکن ہے۔ سوال اور اعتراض کی گنجائش وہاں ہوتی جہاں کہ خدا کسی ایک ہستی کو اعلیٰ مرتبے پر فائز کرنے کے بعد اور باقیوں کے لئے قدغن لگائی جاتی تو یہ نہیں ہے بلکہ خداوندِ عالم اپنی عزیز کتاب میں ہمیشہ ترقّی اور

بلندی کا، پیش رفت کا، ارتقاء کا اعلان فرماتا ہے، یہ فرماتے ہوئے کہ رسول اللہؐ میں تمہارے لئے اُسوۂ حسنہ ہے یعنی اوّل کا بہترین (demonstration) ہے، تو اُن کی سنّت یعنی جو کچھ کہ انہوں نے کیا اور آپ کے اندر ایسی حکمت رکھتی ہے کہ دُوسرے لوگ بھی امّت اور مُرید ہونے کے باوجود اُس اعلیٰ مقام کو یعنی معراج کو پائیں اور حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہؑ نے کہیں اپنے مقدّس فرامین میں کچھ رُوحوں کو معراجی درجے کی رُوحیں قرار دیا ہے [۲۹/ ۹/ ۱۸۹۹ء، دارالسّلام]۔ اِس سے یہ سوال ختم ہوگیا اور اِس سلسلے میں اگر ہم نے وقتی طور پر اعلیٰ مراتب کو جو انبیا علیھم السّلام کے لئے نظر آتے ہیں اگر ہم نے وقتی طور پر اُن کو ناممکن سمجھا تھا لیکن اُس کے سمجھنے سے اِس کی تہہ تک جانے کے بعد سوال حل ہو جاتا ہے کہ یہ راستہ بالکل آزاد ہے اور پھر جیسا کہ میں نے شروع میں کہا کہ خدا تک جا ملنا ممکن ہے جہاں خدا تک جا ملنا ممکن ہے جہاں خدا فرماتا ہے کہ میں ہی اُس بندۂ مومن کی آنکھ بن جاتا ہوں اور کان، زبان، ہاتھ، پاؤں جو کثرت سے مجھ کو یاد کرتا ہے، نوافل میں میرے قرب کو چاہتا ہے، نوافل کا مطلب ہے جو فرض ہے اُس سے زیادہ خدا کی غلامی بندگی (actually) یہ ترقّی کے جو دروازے ہیں آزاد ہیں۔ پس اگر کسی مصلحت سے بظاہر پیغمبروں کے کچھ ایسے مراتب نظر آتے ہیں تو وہ ایک پروگرام بنانے کے لئے اور وہ ایک انسانوں کے فائدے کے لئے ہیں، تو پھر ایسی بات میں کسی اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں جو ہمارے فائدے کی خاطر کی جاتی ہے، تو لہٰذا پھر وہی بات ہوگئی جس طرح ایک شخص دُنیاوی طور پر اُصول سے کسی کام کو لیتا ہے اور اچھی (theory) سے اور اچھے (technique) سے اُس کو انجام دیتا ہے تو ضرور وہ اُس کام میں کامیاب ہو جاتا ہے اسی طرح دین کا معاملہ ہے اور شاید کسی مقام پر آپ یہ بھی سوال کریں کہ پھر ایسے میں یہ آسانی تو اہلِ اسلام کے لئے میسر آئی اور دُنیا کے اندر ایسے بہت سے لوگ ہیں جو مرکزِ حق سے، ہدایت کی روشنی سے دُور نظر آتے ہیں تو اِس کے لئے جواب یہ ہے کہ وہ بھی ہدایت کے (connection) میں ہیں کہ اُن کے سامنے جو ہدایت دَھری ہوئی ہے اگر وہ اُس پر عمل کریں تو اگلی ہدایت اُن کے سامنے خود بخود آئے گی۔ اِس طرح کرتے کرتے یہ (link) سلسلہ جو ہے یعنی اسلام تک اور اسلام کے مختلف مراحل تک یہ سلسلہ لگا ہوا ہے۔ لہٰذا جہاں خدا نے بہشت اور دوزخ کا تصوّر دیا ہے ثواب اور عِقاب کا سبق دیا ہے وہ اُس میں بات صحیح ہے کہ سستی یا کوتاہی وہ بندوں سے ہوتی ہے اور خدا نے جو کچھ کیا ہے وہ عین عدل کے مطابق ہے، اور اِس کے علاوہ انسان کا ایک ماضی بھی ہے اور مستقبل بھی ہے تو اُس ماضی کو اور مستقبل کو بھی اِس زندگی میں شامل کریں تو انصاف کا جو بھی تقاضا ہے وہ وہ پورا ہو جاتا ہے یعنی کہ صحیح معنوں میں پورا ہو جاتا ہے، تو خدا نے عدل کے سلسلے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے، اِس لئے۔

جی ہاں! انہوں نے سوال جو کیا وہ دَرجات کے بارے میں کیا تو ہم نے اُن کو بتایا کہ مومن خدا تک جا ملتا ہے اور دُوسری بات یہ ہے اسی سلسلے میں خدا نے قرآن کے اندر سیڑھی کا تصوّر دیا ہے اور سیڑھی کو عربی میں قرآن کی زبان میں

''معراج'' کہا جاتا ہے اور اِس کی جمع ''معارج'' ہے تو خدا نے خود کو سیڑھیوں والا کہا ہے (۷۰:۳) اور سیڑھیاں اور کسی چیز کی نہیں ہیں، بس یہی درجات ہیں جن کا آپ نے ذکر کیا جن کے بارے میں ہم نے بھی ذکر کیا، تو ایک لحاظ سے یہ آسمان کی چھت کی سیڑھیاں ہیں اور اگر مانا جائے کہ یہ سیڑھیاں ہیں تو یہ رُوحوں کو بلند کرنے کے لئے ہیں یعنی جن حدود کا ہم نے ذکر کیا ہے جن انبیا کا اولیاء کا وہ سیڑھیاں ہیں خدا کے زینے ہیں (up stairs) تو اُن (up stairs) سے رُوحیں بلند ہو جاتی ہیں۔

مثال کے طور پر کوئی مہربان باپ ہے اُس کا ایک چھوٹا سا پیارا سا بچّہ ہے، باپ چاہتا ہے کہ بیٹے کو درخت پر چڑھائے تا کہ وہ اُس میں سے پھل کھائے یا باپ یہ چاہتا ہے کہ بیٹے کو چھت پہ چڑھائے کہ ذرا وہ تماشا کرے بلندی سے یا کسی بھی کام سے، تو کیا کرتا ہے وہ دیوار کے ساتھ وہ مہربان باپ کھڑا ہو جاتا ہے اور کسی قدر گھٹنے کو نیچے کرتا ہے تو بچّہ اُس کے گھٹنے پہ چڑھتا ہے پھر اُس کے بعد کندھے کو دیتا ہے تو وہ کندھے پر چڑھتا ہے پھر اُس کے بعد کہتا ہے کہ دیکھو تم میرے سر پر پاؤں رکھو، تو بچّہ اپنے باپ کے سر پر پاؤں رکھتا ہے پھر ہاتھ کو بلند کرتا ہے پھر اُس کو (push) کرکے چھت پر چڑھاتا ہے، تو خداوندِ عالم کے حضور سے جو انبیائے کرام اور ائمۂ عظّام دُنیا میں آئے ہیں وہ رُوحوں کو عالمِ بالا تک چڑھانے کی خاطر آئے ہیں اِس معنی میں اُن کا جتنا عظیم درجہ نظر آئے گا اُس میں مصلحت ہوگی اور اُس میں یہ سوال نہیں ہو سکے گا کہ اگر خدا عادل ہے تو یہ درجے کیوں؟ خدا کے عادل ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اُس نے درجات بنائے تا کہ ہم ایک ایک کر کے اُن درجات سے گزر کر اصل مقام کو پہنچیں۔ اِس مثال کی توثیق میری اگلی بات سے ہوتی ہے جس میں کہ میں نے کہا کہ خدا ایک بندۂ خاکی کی آنکھ بن جاتا ہے، دیکھیں کہ اِس سے کیا خدا کی انتہائی رحمت کا ثبوت نہیں ملتا ہے، خدا کی علوئ شان دیکھئے کہ وہ کس قدر تمام چیزوں سے بلند و عالی ہے لیکن اِس کے باوجود اُس کی رحمت کی انتہا دیکھئے کہ وہ ایک بندۂ خاکی کی آنکھ بن جاتا ہے، پھر کان بن جاتا ہے، ہاتھ بن جاتا ہے، بولنے کے لئے زبان بن جاتا ہے، چلنے کے لئے پاؤں بن جاتا ہے تو پھر رحمت کی حد ہوگئی نا! اِس مثال میں اور اُس مثال میں جس میں کہ ہم نے اِن حدود کو سیڑھی قرار دیا، ہم نے اِن حدود کو سیڑھی نہیں قرار دیا بلکہ خدا ہی نے اِن کو زینے کہا معراج کہا۔ چنانچہ یہ اِس طرح سے ہوگا کہ اگر ایک بندۂ مومن رُوحانیت میں آگے بڑھتا ہے تو سب سے پہلے وہ آدمؑ کے زینے سے چڑھے گا کس طرح چڑھے گا؟ اُس کی تھوڑی سی بات بتاؤں تو آپ کو مزہ آوے، وہ بے پناہ رُوحوں کے درمیان ہوگا کہ رُوحیں آ کر ذرّات آ کر اُس کے لئے اطاعت کریں گے اور اُس کے اندر سجدے کرتے ہوئے گر جائیں گے، کیا خدا نے ملائکہ سے یہ نہیں کہا تھا کہ جب میں آدمؑ کی تخلیق کو مکمّل کروں رُوحانی تخلیق تو اِس سے پہلے نہیں تم اُس تکمیل کے بعد سجدہ کرتے ہوئے آدم میں گر جانا یا آدم کے سامنے گر جانا، اِس میں، میں بھی نہیں ہے سامنے بھی نہیں ہے۔ ''فَقَعُوۡا لَہٗ سَاجِدِیۡنَ'' (۳۸:۷۲)۔

اُس کے لئے سجدہ کرتے ہوئے گر جانا۔ ایک تو دیکھیں اِس کے اندر اگر تاویل نہیں ہے تو دو دفعہ یعنی گرنا اور سجدہ کرنا یہ کیوں ایسا ہے، سجدہ کرنا بھی خود جھکنے کو کہتے ہیں اور گرنا کیوں؟ اِس لئے کہ یہ تاویل ہے اور تاویل میں رُوح کے ذرّات آدم کے اندر گرے ہوئے تھے، تو جب بندۂ مومن پر یہ واقعہ گزرے گا تو اُس وقت وہ بندۂ مومن آدمؑ کے درجے سے دو چار ہو جائے گا اور وہی لاتعداد رُوحیں نوحؑ کی مثال کو پیش کریں گے کہ اُس وقت بندۂ مومن دیکھے گا کہ وہ رُوحوں کے ایک طوفان کے درمیان ہے اور رُوحانیت کا ایک بے پناہ طوفان اُٹھے گا وہ خود اپنی رُوحانی آنکھوں سے دیکھے گا کہ دُنیا کے بہت سے لوگ اُس طوفانِ رُوحانیت میں ہلاک ہو گئے اور سوائے مومنین کے اور ذکر کی کشتی میں بیٹھے ہیں، خدا کی تسبیح پڑھتے ہیں تو یہ نوحؑ کا درجہ ہے۔ اسی طرح ایک وقت میں ایک آگ آئے گی اُس سے آگ کھیلے گی وہ آگ سے کھیلے گا اور کچھ وقت کے بعد وہ جو آگ ہے بجھ کر رُوحانیت کا گلشن بن جائے گی۔ علیٰ ھذا القیاس یکے بعد دیگرے وہ اُن حضراتِ انبیاء کے مراتب کا مشاہدہ کرے گا، مشاہدہ کرے گا۔

اُن کی شناخت کرے گا اور یکے بعد دیگرے اُس کے سامنے یہ زینے آتے جائیں گے وغیرہ، تو اِس سے معلوم ہوا کہ دَرجات سیڑھیوں کی طرح ہیں اور اِن بڑے بڑے درجات کے تحت ذیلی طور پر کتنے لاتعداد دَرجات ہوں گے اور اسی طرح بندۂ مومن اپنی رُوحانیت میں پچاس ہزار برس کا سفر طے کرے گا۔ جس طرح کہ قرآن میں ہے کہ ایک رُوح اور فرشتے خدا کے حضور تک پچاس ہزار برس میں پہنچ جاتے ہیں (۷۰: ۴) تو دُنیا کے حساب سے وہ پچاس ہزار برس کا سفر ہے لیکن رُوحانیت میں ایک بندۂ مومن کی جب رحمتِ خداوندی دستگیری کرتی ہے تو وہ اِس تیزی سے برق رفتاری سے مسافتوں کو طے کرتا چلا جاتا ہے اور اُس کی عبادت اور ذکر کے سال بنتے ہیں ایک حساب سے۔ مثلاً چاندی کو اور دُنیا کے کسی مال کو جب ہم برابر کرتے ہیں تو اُس میں جو چاندی کی مقدار ہوتی ہے وہ تھوڑی ہوتی ہے اور سونے کو اور دُنیا کی چیزوں کو جب ہم مقابل کرتے ہیں تو سونے کی مقدار بہت تھوڑی ہوتی ہے، اِس طرح رُوحانیت کے جو سال ہیں وہ اعلیٰ ہونے کی وجہ سے اُن کی مدّت بہت معمولی ہوتی ہے اور دُنیا کے پچاس ہزار برس کو ایک اعلیٰ قسم کی عبادت (cover) کر سکتی ہے جس میں کہ خدا کی دستگیری ہو، جس میں کہ اسمِ اعظم اپنے مکمّل ظہور میں کام کر رہا ہو، تو آپ کا یہ سوال تھا۔

اچھا اور بھی سوالات کرنے ہیں اور دیکھنا ہے کہ نور کے بارے میں آپ نے کیا کچھ کیا ہے۔ جی ہاں! اور اگر آپ سوالات نہیں کرتے ہیں تو میں تھوڑی سی نور کے بارے میں بات چیت کروں گا اور وہ بات یہیں سے شروع ہوتی ہے کہ عزیزانِ من! دیکھئے کہ خدائے علیم و حکیم نے ارشاد فرمایا ہے کہ قرآن کے اندر بہت سی کتابیں ہیں یعنی آسمانی کتاب کے اندر بہت سی کتابیں ہیں، ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی۔ باطن کا مطلب یہ ہے کہ امام خدا کی بولنے والی کتاب ہیں، جب مشاہدۂ رُوحانیت میں امامؑ کے نور تک کسی کی رسائی ہوتی ہے تو اُس کو پتا چلتا ہے کہ خدا کی اِس بولنے والی کتاب کے اندر

کتنی کتابیں اور ہیں، مثال کے طور پر جب رُوحانیت کے دروازے کشادہ ہو جاتے ہیں، وا ہو جاتے ہیں یعنی کھل جاتے ہیں تو اُس وقت نور کا مشاہدہ ہوتا ہے جو امام کا مشاہدہ ہے، جو خدا کی بولنے والی کتاب ہے، لیکن اُس ایک کتاب کے اندر بہت سی کتابیں ہیں یعنی وہاں پر آپ کے سامنے جتنے اسمِ اعظم کھل جائیں گے اُن میں سے ہر ایک، ایک کتاب ہے، کلماتِ تامات میں سے ہر کلمہ ایک کتاب ہے اور ہر اشارہ ایک کتاب ہے ہوگئی یہ باطن کی بات اب میں ظاہر میں آیئے قرآن کی طرف آیئے تو اِسی طرح قرآن کے اندر بھی بہت سی کتابیں ہیں قرآن تو ایک ہے لیکن اُس کے اندر ایسی آیات ہیں یا ایسے موضوعات ہیں کہ اُن میں سے ہر موضوع بجائے خود ایک ضخیم کتاب ہے۔ چنانچہ قرآن کے اندر ایک کتاب جو ہے وہ کتاب نور ہے، اُس کا نام کتابِ نور ہے اور یہ کتابِ نور اُن کے لئے ہے جن کو چشمِ بصیرت عطا ہوئی ہے، یعنی حقیقی مومنین جو امامؑ کی ہدایت کی روشنی میں ہیں اُن کے لئے ہے۔ نور کا موضوع یا کہ نور سے متعلق آیات ایک روشن کتاب کی حیثیت سے ہیں مگر امامؑ کی تائید سے اور امامؑ کی تائید کے بغیر نہیں۔ پس ہم نے سب سے پہلے کتابِ نور کے مطالعے کا آغاز کیا ہے۔

دیکھیے کتابِ نور کس قدر روشن ہے اور اُس کے سمجھنے سے تمام آیات پر کس شان سے روشنی پڑتی ہے اُس کی ایک مثال عالمِ ظاہر سے لیجئے یعنی اِس کائنات سے۔ آپ حرکت کی اہمیت کو جانتے ہیں کہ حرکت کی کیا قدر و قیمت ہے اور اُس کی اہمیت و افادیت کیا ہے، چنانچہ اِس کائنات کے اندر سورج نہ صرف روشنی کا منبع ہے بلکہ حرکت کا بھی سرچشمہ ہے وہ سب سے عظیم محرّک ہے اِس کائنات کے اندر، اِس وسیع و عریض کائنات کے اندر جو چیزیں حرکت کرتی ہیں یا جو چیزیں ذیلی طور پر محرّک ہیں وہ اِس سورج کے بدولت ہیں۔ سائنسی طور پر آپ جنرل سائنس کو سامنے رکھ کر سورج کی کیفیت کو ذرا (study) کریں تو آپ کو پتا چلے گا کہ اِس کے اندر کیسے دھماکے ہوتے ہیں اور کس طرح اُس میں ایٹم یعنی ذرّات پھٹ جاتے ہیں اور مادّہ کی تحلیل ہو جاتی ہے اور مادّہ نور میں تبدیل ہو جاتا ہے اور وہاں سے کیسی کیسی لہریں طوفانی موجیں اُٹھتی ہیں اور اُس سے اِس پوری کائنات میں کس طرح حرکت پیدا ہو جاتی ہے اِس کو آپ سائنس کی کتابوں میں پڑھ سکتے ہیں، تو اِس کائنات کے اندر نور کی کتاب سورج ہے، چاند اور ستارے اور روشنی کے دیگر ذرائع اور روشنی کے تمام ذرائعوں کے آپس میں (connection) ہے۔ آپ اِس بات کو باور کریں گے کہ اِس دُنیا کے اندر اگر بجلی ہے یا آگ ہے یا جلنے والی گیس ہے تو وہ چیز دُوسری چیزوں سے بڑھ کر سورج سے رابطہ رکھتی ہے یا یہ کہ وہ چیزیں سورج کے اثرات ہیں۔ اِس لئے اِس کائنات کے اندر جتنی چیزیں روشن ہیں یا منوّر ہیں وہ سب سورج سے وابستہ ہیں، ویسے تو پوری کائنات سورج کی پیداوار ہے، تاہم اِن میں سے بعض چیزیں ایسی ہیں جو سورج کے بہت ہی نزدیک ہیں، پس ماننا چاہئے کہ اِس ظاہری کائنات میں بھی نور کی ایک کتاب ہے۔ چنانچہ اگر ہم نے قرآن کے اندر جو نور کی کتاب ہے اُس کو سمجھنا ہے تو اِس بیرونی کتاب کو ذرا

سامنے رکھیں اِس میں غور کریں جو کائنات کی روشنی کا سرچشمہ ہے اور اگر باطن میں جو نور ہے اُس کو سمجھنا ہے تو بھی ہمیں اِس دُنیائے ظاہر کے اندر جو نور کی کتاب ہے اُس پر غور کرنا چاہیئے ۔ ہم نے کہا کہ ساری حرکت سورج سے پیدا ہوتی ہے، دُنیا کے اندر اگر ہوا چلتی ہے یا بارش برستی ہے یا پانی بہتا ہے یا سیّارۂ زمین گردش میں ہے اور ایسی بہت سی چیزیں ہیں یہ نظامِ شمسی سے ہیں، نظام ایک عربی لفظ ہے، نظام پرونے کو کہتے ہیں، موتی کو، مونگے کو کسی دھاگے میں پرونا، (literal meaning) میں یہ نظام ہے اور نظم اور منظوم بھی اسی لفظ سے ہیں تو اِس سے ظاہر ہے کہ اِس کائنات کو نظامِ شمسی اِس لئے کہا کہ جہاں سے جہاں تک چیزیں سورج سے وابستہ ہیں یا سورج سے منسلک ہیں یا سورج کی قوت کے دھاگے میں پروئے ہوئے ہیں تو اُن چیزوں کو نظامِ شمسی کہا جاتا ہے ۔ یہ بھی اِس کائناتِ ظاہر کی نورانی کتاب کی بات ہوئی ۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ ہمیں آیاتِ نور کو جیسا کہ چاہئے سمجھنا چاہیئے ۔

میرے خیال میں آیاتِ نور کو صحیح معنوں میں سمجھ لیا جائے، تو پھر قرآن میں کوئی مسئلہ ہی نہیں رہے گا اور ہمارے بہت سے سوالات حل ہو جائیں گے یا یہ ہو سکتا ہے کہ اگر ہم نے اچھی طرح سے (study) کی ہے تو ہمارے تمام سوالات مستقلاً حل ہو جائیں، جیسا کہ اُس روز یہ ذکر ہوا تھا کہ نور ہی نے یہ وحدت کا تصوّر دیا کہ نور کبھی اللہ سے منسوب ہوا اور کبھی رسول سے اور کبھی امام سے، کبھی قرآن سے، کبھی اسلام سے اور پھر کبھی مومن سے، نور ہی نے ہم کو توحید کا ایک سبق دیا، توحید کا درس دیا ۔ جب فرمایا گیا کہ نور اللہ کا، نور رسول کا، نور امام کا، نور قرآن کا، نور اسلام کا اور نور مومنین کا، دیکھیں ! نور کی یہ گنجائش کہ سب کو اپنے اندر سمو لیتا ہے یعنی سب کو ایک کر دیتا ہے جہاں بندۂ مومن کے خدا سے واصل ہو جانے کی بات ہم مان لیتے ہیں تو وہاں یہ سوال باقی نہیں رہتا ہے کہ آیا رسول اور امام، خدا سے الگ ہیں یا کہ نورانیت میں ایک ہیں، تو یہ ایک فضول سا سوال بن جاتا ہے، جبکہ ہم اِس حقیقت کو مان لیتے ہیں اور خدا نے حدیثِ قدسی میں یہ ارشاد فرمایا کہ میں ہی بندۂ مومن کی خودی بن جاتا ہوں، جب ہمارے اعضاء کو ایک ایک کر کے وہ لیتا ہے اور ہمارے اعضاء خدا کے نور میں فنا ہو جاتے ہیں جب خدا ہماری آنکھ بن جاتا ہے تو ہماری اپنی آنکھ اُس میں فنا ہو جاتی ہے، ہماری اپنی آنکھ فنا ہو جاتی ہے، جب خدا بندۂ مومن کا کان بن جاتا ہے، تو مومن کی سماعت فنا ہو جاتی ہے، جب خدا اپنے کسی عزیز بندے کی زبان بن جاتا ہے تو خدا کے اُس پیارے کی زبان خدا کے نور میں فنا ہو جاتی ہے، جب خدا کسی کا ہاتھ بن جاتا ہے، تو یہ ہاتھ اپنے آپ حرکت نہیں کرتا بلکہ مشیّتِ الٰہی سے حرکت کرتا ہے لہٰذا ہاتھ کی اپنی حرکت فنا ہو جاتی ہے تو اُس میں خدا کی حرکت آتی ہے، جب خدا اپنی بے پناہ رحمت سے کسی بندۂ مومن کا پاؤں بن جاتا ہے تو پھر حد ہوگئی اور بات ختم ہوگئی ۔ اب اِس بندے کی انا اور خودی کو آپ ڈھونڈیں نہیں ملے گی اور پھر کیا خودی رہی، دیکھا آپ نے کہ مومن کے اصل مقام کا کیا حال ہے اور رحمتِ الٰہی بندوں کو کس طرح نوازتی ہے، تو پھر اِسی کے ساتھ ساتھ انسانِ کامل کی طرف سے یا انسانِ کامل کے بارے میں جو ہمارے دلوں

میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہوجاتے ہیں وہ سب یکسر ختم ہوجاتے ہیں۔کتنا آسان درس دیا مولا علیؑ نے یہ فرماتے ہوتے کہ: مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَه رَبَّہٗ۔اگر فرمایا جاتا کہ تم خدا کی شناخت کرو یا پیغمبر کی یا امام کی تو اِن مقدّس ہستیوں کا وجود ہم سے الگ ہونے کی وجہ سے ہم کیا پاتے اور کس طرح باور کرتے اور اگر باور بھی کرتے تو پھر اپنے بارے میں کیا فیصلہ کرتے، اچھا ہوا کہ بہت ہی نچلی سطح پر ایک نمونہ بتایا اور ایک درس دیا کہ جس کے سمجھنے سے ساری باتیں ختم ہوجاتی ہیں اور خدا اور رسول اور امام کا نور ایک ہی نظر آتا ہے،تو یہ نور کی کتاب کی بدولت ہے کہ اُس نے ہمارے بہت سے سوالات کو ختم کئے۔

اِس کے علاوہ ایک عظیم راز اور بھی ہے، اسماعیلی مذہب کی حقیقت کو پیش کرنے کے لئے یا اُس کے ثبوت کو فراہم کرنے کے لئے جس طرح روشن دلیلیں نور سے متعلّق ملتی ہیں اتنی روشن دلیلیں کہیں سے نہیں ملتی ہیں۔اِس لئے خدا نے ارشاد فرمایا کہ میرا نور دُنیا میں ہمیشہ قائم و دائم ہے اور اتنا فرما کر مزید تفصیل نہ بتاتا تو بات سمجھ میں نہیں آتی یعنی اگر خدا یہ نہیں فرماتا کہ اُس کے نور کی کیا شکل ہے کیا صورت ہے اور کہاں ہے تو اُس نے وضاحت کرتے ہوئے رسول کو اپنا نور قرار دیا تو دانشمند کے لئے حقیقت عیاں ہوگئی کہ نورِ الٰہی انسانی شخصیت میں موجود ہے۔اِس میں نور کا تعیّن ہوگیا، نور کی شکل وصورت کا پتا چلا، نور کی کیفیت کا علم ہوا، اور خدا نے اپنے آپ کو جہاں کائنات کی روشنی قرار دیا آسمان وزمین کی بلندی وپستی کے لئے خود کو نورِ ہدایت بتایا خود کو نورِ ہدایت قرار دیا (۲۴:۳۵) تو اُس کے بعد اپنے رسول سے فرمایا کہ آپ ہی ہیں جو سراجِ منیر ہیں (۴۶:۳۳) تو اِس میں یہ (reference) آگے جو بات ہوئی تھی اُس کا(reference) اس آیت میں مل گیا یعنی یہ جو آیت ہے جس میں پیغمبر کے نور ہونے کا ثبوت ملتا ہے تو یہ آیت اُس اگلی آیت کی تشریح ہوئی کس آیت کی، اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (۲۴:۳۵)۔اب ہمارے سامنے سوال پیدا ہوا تھا کہ اِس نور سے رسائی کس طرح ہو، اور دوسرا یہ سوال یہ کہ آیا اِس نور کا کوئی مرکز بھی ہے یا نہیں۔کوئی دروازہ ہے، کوئی رستہ ہے، خدا جہاں کائنات کا نور ہے ہم اُس نور کو کیسے پہنچیں، کیسے شناخت کریں، کس طرح اُس کا رستہ پائیں؟ تو خدا نے اِس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ رسول میں نے تم کو سراج منیر کی حیثیت سے بھیجا ہے (۴۶:۳۳)۔اب اِس کے یہ معنی ہوں گے کہ یہ جو رسول سراجِ منیر ہیں تو حقیقت میں وہی نور ہیں جس کے متعلق فرمایا گیا تھا کہ اللہ کائنات کا نور ہے، کائنات کی بلندی وپستی کا نور ہے، خدا کے یہ الفاظ اِس قدر جامع ہیں کہ اِس سے کوئی چیز باقی نہیں رہتی ہے، زندہ حقیقت اور وہ ایک شخصیت قرار پائے۔جس طرح کہ دُوسری آیت میں ہم نے دیکھا تھا کہ نور انسانِ کامل کی حیثیت میں ہے، تو پھر آنحضرتؐ اپنے وقت میں قرآن کے نور قرار پائے۔

اب آپ نے دیکھا کہ زمانۂ نبوت میں آسمانی کتاب کا نور آنحضرتؐ ہیں اور اگر خدا یہ نہ فرماتا کہ میرے نور کو بجھایا

نہیں جاسکتا تو اِس سے لوگ گمان کرتے کہ رسولؐ کی رُحلت کے بعد اب کوئی نور نہیں ہے اور خدا نے اُس رستے کو مسدود ہی کیا جس کے متعلق لوگوں کو یہ گمان ہوسکتا تھا کہ زمانۂ رسول میں قرآن کا نور تھا اب قرآن کا کوئی نور نہیں ہے تو خدا نے بڑی شان سے فرمایا کہ میرے نور کو بجھانا تو بہت ہی لوگ چاہیں گے لیکن میں اِس نور کو کامل اور مکمّل کر کے رہوں گا (۶۱:۸)۔ تو اب رسولؐ کی شخصیت موجود نہیں ہے پھر اسماعیلیوں کے تصوّر کے مطابق بعد از نبیؐ جو علیؑ تھے وہ اپنے وقت میں نورِ قرآن اور معلمِ قرآن تھے، نورِ قرآن مادّی (sense) میں نہیں! نورِ قرآن کچھ اِس طرح سے کہ قرآن پر روشنی ڈالے اور قرآن پہ روشنی معلمِ قرآن ہی ڈال سکتا ہے جو خدا کے حضور سے مقرّر ہو تو خدا کے حضور سے آنحضرتؐ اپنے وقت میں مقرّر تھے اور پھر آپ کے بعد مولا علیؑ معلمِ قرآن اور نورِ قرآن کی حیثیت سے مقرّر تھے۔ علیٰ ھذا القیاس تا ایندم یہ نورِ قرآن آج ظاہراً و باطناً اسماعیلیوں کے درمیان موجود ہیں۔ اب اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اگر امام نورِ قرآن ہیں تو بہت سے لوگوں کو رسولؐ ہی کی طرح دعوت دیں اُن کو سکھائے سمجھائے وغیرہ، یہ سوال دُرست نہیں ہے کیونکہ خدا نے پیش گوئی کی تھی: ”وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا“ (۳:۱۰۳) اگر لوگوں کو جمع کیئے رکھنا خدا اور رسول کا فرض ہوتا اور رسولؐ کے بعد امامؑ کا فرض ہوتا تو خدا یہ حکم نہ دیتا ”وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا“۔ مسلمانو! تم اللہ کی رسّی کو جو، اب تمہارے سامنے ہے مل کر مضبوطی سے پکڑے رہنا اور فرقہ بندی نہ کرنا، فرقہ فرقہ نہ ہوجانا، اگر اِس میں سب لوگوں کو جمع کیئے رکھنا امام کا فرض ہوتا تو اُن سے نہ فرمایا جاتا۔

خدا کے علم میں یہ واقعہ روشن تھا کہ بعد از نبی مسلمانوں کا شیرازہ بکھر جائے گا تو خدا نے اتمامِ حجّت کے طور پر اُن کو حکم دیا کہ واقعہ ایسا ہونے والا ہے، اِس کے لئے تم احتیاط رکھنا اور خدا کی رسّی کو بہت مضبوطی کے ساتھ مل کر پکڑے رہنا، اِس سے کئی حقیقتیں روشن ہوجاتی ہیں۔ اگر اکیلا قرآن خدا کی رسّی ہوتا تو اِس خدا کی رسّی کو سب لوگوں نے سینے سے لگائے رکھا ہے اگر اسلام کا جو نام ہے وہ خدا کی رسّی ہوتا تو اُس کے لئے کسی کو کوئی انکار نہیں ہے اور اُس میں سب متفق علیہ ہیں۔ اب رہا امامؑ کی ذات تو یہ بے شک خدا کی رسّی ہیں اِس لئے لوگوں سے فرمایا گیا تھا کہ تم رسولؐ کے بعد امامؑ کے مقدّس دامن سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو کر رہنا تو یہ اِن سے نہیں ہوسکا اگر ترقّی کی وہی رفتار قائم رہتی اب اگر وہی اطاعت جو زمانۂ رسول میں تھی باقی رہتی سب مسلمین امامؑ کی اطاعت کو اپنا فرض سمجھتے۔۔۔

ٹائپنگ: شناوزیر علی　　　نظرِ ثانی: اکبر علی　　　پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیرالدّین نصیرؔ ہونزائی ؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: کتابِ نور

کیسٹ نمبر: Q-15-B   تاریخ: ۱۵؍دسمبر، ۱۹۸۱ء کراچی

Click here for Audio

۔۔۔تو اسلام کے اندر مختلف مملکتیں حکومتیں قائم نہ ہوتیں، ایک ہی حکومت ہوتی اُس میں اختلاف نہ ہوتا، آپس میں جنگیں نہ ہوتی، یہ انتشار نہ ہوتا اور یہ زوال نہ ہوتا۔ آج خدا کے حکم سے اور خدا کے وعدے کے مطابق دُنیا کے اندر ایک انتہائی (powerful) اسلامی اور ربّانی حکومت ہوتی، وہ ایسی حکومت ہوتی کہ وہ دُنیا کی حکومت سے بہت ہی منفرد، مختلف اور ممتاز ہوتی، اُس میں کیا نہیں ہوتا، اُس میں سائنس کا دور دورہ ہوتا، اُس میں ترقّی ہوتی، اُس میں عدل و انصاف ہوتا، اُس میں اتحاد ہوتا اور اُس میں وحدت و سالمیت قائم ہوتی، اُس کا کوئی عظیم مرکز ہوتا وہ امام ہی ہوتے جو بادشاہ بھی ہیں، اور خلیفہ بھی ہیں، امیرالمومنین بھی ہیں اور جانشین رسول بھی ہیں، نورِ ہدایت بھی ہیں اور سب کچھ۔ آپ یہ قیاس کریں کہ قرآن کے نہ سمجھنے سے یہ مصیبت آئی، یہ زوال آیا، تو قرآن کا سمجھنا انتہائی ضروری ہے، تمام مومنین پر واجب ہے اِس لئے ہم نے آیاتِ نور کو بنیاد قرار دیا ہے اِس کلاس کے سلسلے میں تو ہمیں چاہئے کہ آیاتِ نور کو اچھی طرح سے سمجھیں اور بار باراُن کا مطالعہ کریں کیونکہ آپ باور کریں کہ یہ ایک اُصول ہے۔

ربّانی تائید کب آتی ہے، میں سوال کرتا ہوں یعنی خدا کی مدد یا خدا کی توفیق یا روحانی از قسمِ الہام یا ایسی کوئی شئ کب آتی ہے؟ کیا سوتے ہوئے، کیا کھیلتے ہوئے، کیا ہنسی مذاق کرتے ہوئے، نہیں! اُس کے لئے دو وقت ہیں، ایک یہ کہ ذکر و عبادت کے دوران یا اُس کے نتیجے میں، ایک یہ کہ اعلیٰ درجے کی کتابیں جب آپ دل سے اور اُمید سے، یقین سے مطالعہ کرتے ہیں تو اُس دوران آسمانی تائید آتی ہے۔ آپ یہ بات نہ بھولیں جو اعلیٰ درجے کی کتابیں ہیں اُن کے متعلق آپ کا یہ خیال نہ ہو کہ آپ نے اُن کو پڑھا اور ختم کیا، یہ بات نہیں ہے، اُن کو اِس لئے بھی پڑھیں کہ اُن کو خلوصِ دل سے اور یقین سے پڑھتے پڑھتے جب آپ اِس حالت میں ہوں گے اِس کیفیت میں ہوں گے تو آپ پر آسمانی معجزے گزریں گے وہ یہ کہ کسی نکتے پہ آپ ٹھہرے ہوئے ہیں غور کرتے ہیں تو یکا یک آپ کے دل کے اندر ایک نور کا جھٹکا سا لگے گا، بڑا انوکھا، نرالا اور میٹھا جھٹکا ہوگا، آپ چونکیں گے کہ کیا ہو رہا ہے، یہ تائید کا ایک کرشمہ ہے، تائید کی ایک مثال ہے ایک نمونہ ہے اِس طرح آپ کے دل کا جو (globe) ہے اُس میں وسعت پیدا ہو جائے گی پھر مزہ آئے گا، دوبارہ بھی ایسی جو

اعلیٰ کتابیں ہیں اُن کو آپ پڑھتے رہیں گے اِس اُمید سے کہ وہ ایک اعلیٰ عبادت ہے اور اُس کو علمی عبادت کہتے ہیں۔ خدا کرے کہ آپ کی بہت ترقی ہو، آپ کو پتا چلے گا کہ آگے چل کر کہ آگے چل کر علمی عبادت بھی ہوتی ہے، وہ علمی عبادت غور و فکر اور خدا کی تائید کی، دستگیری کی روشنی میں ہوتی ہے، تو اِس کے لئے آیاتِ نور کے بارے میں آپ غور کریں۔

اِس سلسلے میں ایک نکتہ اور بتاتا ہوں، دیکھیں کہ جس روز ہم نے ایک نور کو تمام آیاتِ نور کی سردار مانا تھا اُس کے بارے میں ایک بات کرتا ہوں کہ اُس آیت کے پہلے (portion) میں ہے کہ: ''اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' (۳۵:۲۴) خدائے واحد ہی اِس ساری کائنات کی بلندی و پستی کا نور ہے، آگے چل کر فرمایا جاتا ہے کہ: ''نُّوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ'' (۳۵:۲۴) ایک نور پر دوسرا نور۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تو ایک ہے اور اُس کی وحدانیت میں کثرت کا تصوّر ہی نہیں پھر ''نُّوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ'' کا یہ تصور کہاں سے پیدا ہو گیا؟ ''نُّوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ'' میں کثرت کی بات ہے اور: ''اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' میں وحدت کی بات ہے تو وحدت میں کثرت کی بات کیوں؟ یہ سوال ہے۔ اِس کا جواب یوں ہے کہ امام کی شخصیتوں کو بھی یہاں نور کہا گیا ہے، اگر اِس آیت کے اندر ''نُّوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ'' کا تصوّر نہیں ہوتا تو کوئی مومن یہ جرأت نہیں کرسکتا، کہ یہ امام کی شان میں ہے، ''نُّوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ'' کے اِس لفظ نے ہی اِس میدان کو ہموار کر دیا اِس رستے کو صاف کر دیا، کہ ایک امام کے بعد دُوسرا امام، رسول کے بعد امام اور امام کے بعد امام اور شروع سے لے کر آخر تک ہمیشہ کے لئے ایک شخصیت کے بعد دُوسری شخصیت۔ ترجمہ کرنے والوں کو ذرا دیکھیں کہ انہوں نے کس طرح ترجمہ کیا ہے، انہوں نے ایک نور کے بعد دوسرا نور، ایک لفظ کو ضرور استعمال کیا ہوگا اگر انہوں نے نہیں کیا ہے تو نور پر نور اِس طرح سے کہا ہوگا، خدا کا جو تصوّر بے مثال ہے اُس کے پیشِ نظر یعنی ''نُّوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ'' صحیح نہیں جب تک کہ پیغمبر کے بعد امام کو نور نہیں مانیں اور ایک امام کے بعد دوسرے امام کو نور نہیں مانیں۔

آپ کو قرآن میں ایسا مفہوم بھی ملے گا کہ جس کے تحت نور کی شناخت کی واحد شرط تقویٰ ہے، آپ کو وہ آیت بتائیں گے، اب آپ تقویٰ کے بارے میں سمجھ لیجئے کہ تقویٰ کیا ہے، تقویٰ اسلام میں اور قرآن میں ایک ایسا لفظ ہے، کہ تمام عبادات کو یہ (cover) کرتا ہے، تمام عبادات کی رُوح کو (cover) کرتا ہے عبادات کے ظاہر کو نہیں، عبادت سے جو کچھ حاصل آنا چاہئے اگر وہ حاصل آیا ہے تو تقویٰ ہے اور اگر عبادات کی جاتی ہے لیکن اُس کا پھل نہیں مل رہا ہے تو یہ تقویٰ نہیں، یہ تقویٰ اتنا اُونچا لفظ ہے تو نور کی شرط تقویٰ ہے، نور کی شرط تقویٰ ہے تو یہ کوئی آسان شرط نہیں ہے۔ بڑی مشکل شرط ہے، بڑی مشکل شرط ہے اور تقویٰ کے مطلب کو ایک اور طرح سے میں آپ کو سمجھاؤں گا قرآن کے شروع میں آپ نے پڑھا ہے: ''الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' (۲:۱۔۲) الم جس حقیقت کے (symbolic letters) ہیں وہ ایک کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں اور اُس کتاب میں جو کچھ ہدایت ہے وہ متّقین

کے لئے مخصوص ہے تو یہ ظاہری قرآن سے الگ بات ہوگئی، وہ امامؑ ہے ایسی کتاب جس کی شرط تقویٰ ہے اور تقویٰ کی بنیاد پر اُس کتاب سے رسائی ہو جاتی ہے وہ کتاب امام ہے، تو مومنین سے ایک مقام پر مسلمین سے فرمایا گیا ہے کہ تم خدا پر صحیح معنوں میں ایمان لاؤ، رسول پر تا کہ رسول تم کو ایک نور مقرّر کرے تا کہ تم اُس کی روشنی میں زمانے میں اور ماضی میں مستقبل میں چل سکو یعنی صراطِ مستقیم پر [حوالہ] اِس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نور کے بغیر چلنا ہی نہیں ہے، تاریکی میں کون کیا چلے اور مومنین کو صراطِ مستقیم ہی پر چلنا چاہئے اِس کا مطلب یہ ہوا کہ یہی ایک نور ہے جو صراطِ مستقیم کے لئے مشعلِ ہدایت ہے اور اِس تک رسائی کی شرط صحیح معنوں میں ایمان لانا ہے خدا پر، رسول پر اور تقویٰ کو اختیار کرنا ہے، خدا سے ڈرنا ہے، اگر "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللهِ" کہنا تقویٰ ہے اور اِس کے کہنے کے ساتھ ساتھ خدا و رسول اور خلیفۂ رسول تک رسائی ہو جاتی ہے تو پھر یہ کیوں ارشاد ہوا کہ تم تقویٰ کے شرط کو بجالاؤ تا کہ تمہارے لئے نور مقرّر کیا جائے۔

آپ سوال کریں گے کہ امام دُنیا میں حیّ و حاضر ہے پھر اِس تقویٰ سے کیا فرق ہوتا ہے؟ جس کو دیکھنا چاہئے وہ دیکھ سکتا ہے کہ دُنیا میں امام ہے لیکن یہ بات نہیں ہے، امام کو کچھ اِس طرح سے سامنے لایا گیا ہے، کہ اُس کی شناخت کے لئے یہ آنکھ کافی نہیں ہے، یہ آنکھ اُس کی ذات کو نہیں پہچان سکتی ہے اُس کے نور کو نہیں دیکھ سکتی ہے، امام کی بشریت ہر وقت لوگوں کے سامنے آتی ہے اور وہی بشریت ہے جس سے کہ لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ بشریت کا کیا مطلب، امام کا ایک انسان ہونا، انسانی بھیس میں انسانی لباس میں ہونا، تو آج کوئی نئی بات نہیں ہوگی وہی ہوگی جو اِس سے پہلے ہوئی تھی وہ یہ کہ جتنے بھی انبیاء قرآن میں مذکور ہیں یعنی جن جن حضراتِ انبیاء کا قرآن میں ذکر ملتا ہے اُن سب کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ جو بھی اپنے زمانے کے پیغمبر کی شناخت سے محروم ہو گئے یا جنہوں نے بھی انکار کیا تو اُس انکار کی وجہ اُن کے نزدیک کیا تھی، پیغمبروں کا بشر ہونا انسانی لباس میں ہونا یہ بہت بڑا امتحان ہے۔ بعد میں جب آپ کو وقت ملے گا تو اِس موضوع کو یکجا طور پر لے لینا اور اِن شاء اللہ ہم جہاں بھی ہوں گے مولا کی مرضی سے آپ کی مدد کریں گے کہ وہ آیات کون سی ہیں جن میں یہ ذکر ملتا ہے کہ لوگوں نے پیغمبروں سے جو انکار کیا اُس کی وجہ اُن کے نزدیک پیغمبروں کی بشریت تھی، بشر تھے پیغمبر، تو اب اِس نورِ خداوندی کو جو لوگ نہیں پہچانتے ہیں جو انکار کرتے ہیں اُس کی وجہ کیا ہے؟ یہی نہ کہ جس طرح زمانۂ انبیا کے منکرین نے انبیا علیہم السّلام کو بشر قرار دیا اور پھر اُن سے انکار کر گئے، انبیاء بشر تھے مگر بہت بڑا فرق تھا پیغمبر اور امام کو چھوڑ کے کیا لوگوں کے درمیان کسی بھی اعتبار سے فرق نہیں ملتا ہے، دُنیاوی ہنر کے لحاظ سے، عادات و اطوار کے لحاظ سے، شکل و صورت کے لحاظ سے اور خاندان کے لحاظ سے اخلاق کے لحاظ سے سب انسان خواہ انسانِ کامل ہے یا انسانِ ناقص، انسان ہیں لیکن اِس میں بہت بڑا فرق ہے لوگ خود اِس کے لئے قائل ہیں لوگ خود بتاتے ہیں جانتے ہیں۔ چنانچہ انسانِ کامل اور عوام النّاس میں آسمان زمین کا فرق پایا جاتا ہے۔

کبھی پیغمبر نے یہ نہیں فرمایا کہ آپ انسان نہیں تھے بشر نہیں تھے، انسان تھے: ”قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ يُوۡحٰۤى اِلَىَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ”(۱۸:۱۱۰) آپ اُن سے کہئے کہ ہاں میں تم جیسا انسان ہوں مگر مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ وحی کیا ہے، علم ہے، آسمانی علم ہے، رُوحانی علم، نورانی علم ہے اور باقی تن بدن کے لحاظ سے آنحضرتؐ بشر تھے، تو لوگوں کی طرح نہیں تو کسی بھی طرح سے حضورؐ کھاتے پیتے تھے، سوتے جاگتے تھے، تھکتے تھے، بیمار بھی ہو جاتے تھے اور شادی بیاہ تھی، اولاد تھی اور اسی طرح سے تو آج لوگوں کے سامنے بشریت کا پردہ ہے، جیسے مولائے روم کسی کلام میں فرماتا ہے کہ: ”چونکہ ہفت سد پردہ دارد آن امام“ کیونکہ امام کے سات سو پردے ہوا کرتے ہیں، اور لوگ اِن پردوں میں سے نہ معلوم کس درجے میں ہیں اور کتنے پردوں سے آگے گزر چکے ہیں اور کتنے اور باقی ہیں یہ تو اُن کی کیفیت پر دارومدار رکھتا ہے۔ بہرحال امام کی بشریت بہت بڑی آزمائش ہے اور یہ آزمائش اب سے نہیں ہے ہمیشہ سے ہے، لوگ آ کر اٹک جاتے ہیں امام کی بشریت میں کہتے ہیں کہ وہ بات بھی ٹھیک یہ بات بھی ٹھیک پر یہ لباس، یہ بشریت اور یہ فلان چیز، یہ بشریت ہی میں آ کر اٹک جاتے ہیں اور دُوسری بات یہ ہے کہ لوگ اپنی ایک کسوٹی بناتے ہیں اپنی طرف سے ایک معیار بناتے ہیں اُس معیار سے امام کو پرکھنا چاہتے ہیں اور وہ اپنے طور پر پرکھ بھی لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اِس پرکھ کے مطابق یہ صحیح ہے، کبھی وہ اپنی عقل کو معیار بناتے ہیں، کبھی وہ شریعت کو، فقہ کو معیار بناتے ہیں کبھی وہ لباس کو اور کبھی داڑھی کو کبھی اِس چیز کو کبھی اُس چیز کو کسوٹی بنا کے پرکھنے کے لئے کوشش کرتے ہیں، لیکن کسی کو حق نہیں پہنچتا ہے کہ جس ہستی کو خدا نے صاحبِ امر قرار دیا ہے اور اُس کا انتخاب اللہ و رسول نے کیا ہے اور اُس کو مختلف زمانے کے کامل انسانوں کی طرح خدا نے برگزیدہ فرمایا ہے اور جس میں خدا کا نور کارفرما ہے تو اُس کو لوگ کیسے پرکھ سکتے ہیں لیکن لوگوں کی عادت کے لئے کیا کیا جائے، لوگوں کی اپنی عادت ہوتی ہے ہر انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بہت دانا ہے اور بہت سمجھنے والا ہے جس رستے پر وہ چلتا ہے وہ صحیح ہے اور سارا علم اُس کے سینے میں محدود ہے اور وہ حق پر ہے وغیرہ۔

ایک حدیث مجھے یاد آئی میں آپ کو بتاتا ہوں: ”وَاَدِرِ الۡحَقَّ حَيۡثُ دَارَ“ خداوندا! علی جس طرف کو گھومے حق کو اُس رستے کی طرف گھما دینا، اگر علیؑ یہاں ہے تو حق یہاں آوے اور اگر وہاں ہیں تو حق اُن کے پیچھے پیچھے وہاں جائے۔ یہ فرق دیکھئے دُنیا کے لوگ حق کی تلاش میں ہوتے ہیں اور ایک مشہور اصطلاح ہے تلاشِ حق اور تلاشِ حقیقت لیکن ایک ہستی ایسی ہے کہ حق اُس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے، وہ حق کے پیچھے پیچھے نہیں چلتا ہے، حق معنی سچائی، حق معنی راستی، حق معنی صراطِ مستقیم، حق معنی سچّا اسلام تو وہ حدیث میں آپ کو بتاؤں گا، یہ بہت عجیب بات ہے جب رسولؐ نے یہ دُعا کی تو خدا نے اُسی وقت اُس کو قبول کیا یا یوں کہنا چاہئے کہ یہ تو مقبول تھی، تو اُس راز کو دُعا کی شکل میں رسولؐ نے فاش کر دیا مومنین پر کیونکہ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ وقوع میں آ چکی ہوتی ہیں وقوع میں وہ آ چکی ہوتی ہیں وہ چیزیں عمل میں آ چکی ہوتی

ہیں لیکن دُعا بعد میں کی جاتی ہے تو یہ بات بھی ایسی ہے کہ رسولؐ نے فرمایا خداوندا! سچائی کو علیؑ کے پیچھے لگا دینا کہ حق علیؑ کے پیچھے پیچھے چلے اور علیؑ کے ساتھ رہے، تو جس طرح قرآن کے متعلق فرمایا گیا کہ قرآن علیؑ ساتھ ہے اور علیؑ قرآن کے ساتھ ہے یہ کچھ اِس معنی میں نہیں کہ جہاں بھی علیؑ جاتے تو اپنے ساتھ قرآن کو اٹھائے جاتے یہ تو باطنی حقیقت ہے، کہ نورِ قرآن اور رُوحِ قرآن علیؑ میں تھا اور علیؑ کا نور معنوی شکل میں قرآن میں ہے۔ جہاں قرآن علیؑ میں ہے تو وہاں ایک زندہ رُوح ہے قرآن، جہاں علیؑ قرآن میں ہے، تو وہ ایک خاموش حکمت کی صورت میں ہے، ایک معنوی حیثیت میں ہے یعنی معنیٰ کی حیثیت میں ہے معنیٰ کی صورت میں ہے، اِس لئے فرمایا گیا کہ قرآن علیؑ کے ساتھ ہے اور علیؑ قرآن کے ساتھ ہے اور جہاں فرمایا کہ بارِ خدایا! حق کو علیؑ کے ساتھ لگانا اور علیؑ جہاں گھومے تو حق بھی وہاں گھومے تو رسولؐ کے بعد علیؑ کی کتنے گھومے، امامت کے مسئلے میں، خلافت کے مسئلے میں اور دُوسرے تمام مسائل میں وہ گھومے انہوں نے حرکت کی تو علیؑ اور دُوسرے امامؑ زندگی میں ذرا بھی حرکت نہیں کرتے، تو حق اُن کے ساتھ نہیں ہوتا چونکہ یہاں گھومنے کی بات ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ علیؑ سے سب ائمہ مراد ہیں کہ رسولِ برحق نے جو بات کی ہے تو وہ قیامت تک رہنے والی بات ہے پورے زمانے سے وہ متعلق ہے، وہ صرف علیؑ کی شخصیت تک کے زمانے تک محدود نہیں ہے اور ہر امامؑ نے اپنے وقت میں جو کچھ کیا یعنی اُس نے ایک حرکت کی یا وہ گھومے۔ امام جعفر صادقؑ کے بعد علیؑ گھومے، مستنصر باللہؑ کے بعد علیؑ گھومے اور ہر زمانے میں امامؑ نے ایک نئی بات کی تو علیؑ گھومے تو اِس گھومنے کے ساتھ ساتھ جو حق ہے وہ اِس طرف کو آگیا اور آج بحمدللہ! امامِ برحق جو ہیں وہ علیؑ ہے اور حق ان کے ساتھ ہے۔ اب اِس گھومنے میں کتنے لوگ پیچھے رہ گئے اور حالانکہ ہر گھومنے میں حق علیؑ کے پیچھے پیچھے آیا اور لوگ اِدھر اُدھر بکھر گئے، وہ سمجھتے ہیں کہ وہ حق اُن کے ساتھ ہے لیکن رسولؐ نے دعا کی تھی جو حق ہے جو سچّائی ہے دین کی سچّائی وہ علیؑ کے ساتھ یعنی امام کے ساتھ رہے، تو یہ ہے۔

عزیزانِ من! اور علی نے فرمایا تھا کہ تم پوچھو اِس سے قبل کہ تم مجھ کو گماؤ گے۔ ”سَلُونِي قَبْلَ أَنْ تَفْقِدُونِي“ یعنی مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں، تم مجھو کو گمانے والے ہو گم کر دینے والے ہو تو اب جو میں تمہارے سامنے ہوں اِس وقت پوچھو اور جب تم مجھ کو گم کرو گے تو پھر تم کس سے پوچھو گے۔ اِس میں دو پیش گوئیاں ثابت ہیں ایک یہ کہ بہت سے لوگوں نے امام کو گمایا اِس پیش گوئی کے مطابق اور دوسری بات یہ کہ ہر زمانے میں پوچھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ صرف امام سے پوچھا جا سکتا ہے ظاہر میں یا باطن میں، تو یہ اشارہ تھا اور واقعاً بہت سے لوگوں نے امام کو گم کر دیا اور اگر وہ قدرتی طور پر اُن کے ہاتھ سے نکل جاتا اور اُس میں خدا کا منشاء ہوتا تو اِس فعل کا اطلاق اُن پر نہیں کرتا اِس فعل کو اُن سے منسوب کیا، تفقدونی، تم مجھ کو گم کرو گے ایسا نہیں کہ جب خدا مجھ کو اُٹھائے گا تو تم کو تکلیف ہوگی تو اِس لئے تم قبل از وقت کچھ کرنا، ایسا نہیں فرمایا تم مجھ کو گم کرو گے اِس میں فعلِ قدرت کا کوئی ذکر نہیں ہے انسانوں کے فعل کا ذکر ہے تم مجھ کو گم کرو گے تو گم

سے یہ مقصد نہیں ہے کہ کوئی شئ غائب ہوجاتی ہے یا کوئی شئ دُنیا سے چلی جاتی ہے، گم سے یہ مطلب ہے کہ انسان کسی چیز کو گم کرتا ہے اپنی غلطی سے لاپرواہی سے وہ چیز ہوتی ہے کہیں بھی اور بات جو اکثریت کے اعتبار سے کہا گیا تھا اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جو اکثریت کے اعتبار سے کہی جاتی ہیں۔

سوال بڑا اہم ہے قرآن سے متعلق ہے یہ کہ نور کا لفظ قرآن میں واحد آیا ہے جمع میں نہیں آیا ہے، جبکہ اِس نور کا (opposite) ظلمت ہے وہ جمع میں آیا ہے یعنی (plural) میں ہے، جہاں نور (singular) میں ہے وہاں ظلمت (plural) میں ہے؟ اِس کی کیا وجہ ہے، یہ سوال ہے۔

جواب: اِس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ نور دو نہیں ہو سکتے ہیں، تین کے ہونے کا سوال ہے ہی نہیں، نور میں کثرت ممکن نہیں یعنی نورِ خداوندی۔ اُس کی مثال یوں ہے کہ دُنیا کی روشنی، دُنیا کی روشنیاں کئی ہو سکتی ہیں مثلاً اِس کمرے کے اندر ایک نہیں کئی ٹیوب کو لگا سکتے ہیں اور ایک بلب نہیں کئی بلب، دُوسرے کمرے میں تیسرے کمرے میں، اِس لئے کہ اِن دونوں کمروں کے درمیان ایک دیوار حائل ہے اور یہاں کی جو روشنی ہے وہاں نہیں پہنچ سکتی ہے، اِس کے برعکس ہم (suppose) کریں خدا کا ایک نور ہو اور رسول کا دُوسرا نور ہو اور امام کا نور تیسرا ہو اِس میں نقص پیدا ہو جائے گا، اور یہ اُس صورت میں ممکن ہو گا جبکہ خدا کا نور محدود اور نارسا ہو، خدا کے نور کا (approach) نہ ہو سکے کچھ جگہوں کو وہ روشن کرے اور کچھ جگہیں ایسی ہوں کہ اُن تک خدا کے نور کی رسائی نہیں ہو رہی ہے، تو پھر اِس کے لئے پیغمبر کو پیدا کیا جائے اور پیغمبر کا نور ایسا ہو کہ وہ کچھ جگہوں کے لئے کافی ہو اور کچھ دُور دُور کے لئے نارسا ہو تو پھر اُس صورت میں امام کا نور ہو، یہ بات نہیں ہے۔ دیکھا اِس میں کہ دو اور تین نور کے ہونے سے نورِ خدا میں نقص پیدا ہوتا ہے نقص کا تصوّر پیدا ہوتا ہے نارسائی کا نقص، محدود ہونے کا نقص، اور ناکافی ہونے کا نقص۔ لہٰذا جب خدا ہمہ رس ہے، عالمگیر ہے، ہر جائی ہے، (omnipresent) ہے، مکان اور زمان کی کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں تک خدا کے نور کی رسائی نہ ہو تو پھر ایک ہی نور ہے، ایک ہی نور۔

اِس نقص کے علاوہ شرک کا تصوّر بھی ہو سکتا ہے کہ ایک نور اور پھر وہ نور محتاج ہے، نارسا ہے، ناکافی ہے تو دوسرا نور پھر اُس بڑے نور کے ساتھ چھوٹا نور شریک پھر تیسرا نور یہ بات ہے۔ ایک ہی نور ہے مگر لوگوں کو سمجھانے کے لئے کہا گیا ہے کہ خدا کا نور، رسول کا نور اور امام کا نور اور دیکھئے نا! کہ خدا فرماتا ہے کہ میں نے نور بھیجا ہے اور خود ہی فرماتا ہے کہ میں کائنات کا نور ہوں: ''اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ'' ایک ایسا لفظ ہے ایک ایسا جملہ ہے کہ وہ کائنات کے ظاہر اور باطن پر محیط ہے۔ جہاں خدا بذاتِ خود آسمانوں اور زمین کا نور ہے تو پھر اب کون سی جگہ خالی رہ گئی، کائنات کے اجزاء تو اِس میں آگئے آسمان زمین کے سوا کوئی چیز نہیں ہے بلندی و پستی کہیں یا کائنات کہیں یا زمان و مکان کہیں یا دونوں جہاں کہیں تو وہ ایک ہی نور ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے پھر کیوں فرمایا کہ میں نے نور کو بھیجا ہے، اِسی سے نور کی دُوئی کا تصوّر ختم ہو جاتا ہے اِس کی وجہ یہ ہے جیسے سورج کا سر چشمہ کہتا ہے دُنیا والوں سے کہ اے دُنیا والوں! میں نے اپنی روشنی کو تم تک پہنچایا ہے، اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ روشنی سورج سے (cut off) ہو کر آ گئی ہے۔ یہ روشنی جسے آپ دھوپ بھی کہہ سکتے ہیں سورج کے سر چشمے سے وابستہ ہے تو بالکل اِس طرح سے کہا کہ میں نے نور بھیجا یعنی رسول اور امام جو میرے اِس سر چشمے کی روشنی ہیں تو روشنی کا تصوّر ملاپ ہے اور (unity) ہے اور وابستگی ہے۔ اب آپ سورج کو ایک نور اور اُس کی روشنی کو جو کائنات میں پھیلی ہوئی ہے دوسری نور اور آئینے میں جو نور ہے اُس کو تیسری نور اور چاند میں جو نور ہے اُس کو چوتھی نور اور ستاروں میں جو نور ہے اُس کو پانچویں نور یہ نہیں کہہ سکتے ہیں۔ اصل میں چاند اور ستاروں میں جو روشنی ہے اُس کا ملاپ ہے سورج سے اور اِس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر ہم رات کے وقت چاند پر پرواز کر کے دیکھیں تو وہاں سے سورج نظر آئے گا یہاں سے تو ہم کو سورج نظر نہیں آتا ہے اِس سے ایسا بھی قیاس ممکن ہے کہ ہم چاند کو سورج سے الگ کوئی روشنی قرار دیں یہ بات نہیں ہے، تو اگر ہم اِس وقت رات کے وقت کسی ذریعے سے پرواز کر کے چاند میں جائیں تو وہاں جانے سے پتا چلے گا کہ اُس کا ملاپ ہے سورج سے۔ اِس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر ہم امام کے ذات میں جا کر جھانکیں تو اُس میں خدا کے نور کے ساتھ ملاپ ہے، پیغمبر میں جا کے دیکھیں تو اُس میں خدا کے نور کے ساتھ (connection) ہے، وابستگی ہے لہٰذا ایک ہی نور ہے، اِس مطلب کو سمجھانے کے لئے خداوندِ عالم نے نور کو صیغۂ واحد میں پیش کیا اور یہ ضروری تھا اور ظلمت خدا سے نہیں ہے کہ اُس کا خاصہ وحدانیت ہو اِس لئے اُس کو صیغۂ جمع میں پیش کیا، نور خدا کی صفت ہے اور خدا کی صفت میں وحدانیت ہوتی ہے اِس لئے اُس کو صیغۂ واحد میں پیش کیا گیا۔ یہ ایک مختصر سا جواب ہے اور اِس کی بہت زیادہ وضاحت بھی ہو سکتی ہے لیکن میرے خیال میں یہ کافی ہے، نہیں تو آج شاید وقت ہو چکا ہے اور سوالات کے لئے بھی خاص پروگرام نہیں ہے۔

بہر حال یہ ایک ملاقات تھی اور یہ ایک محفل تھی اِس کے لئے میں آپ سب حضرات کا شکر گزار ہوں اور بڑی خوشی ہوئی کہ آپ سب تکلیف اُٹھا کے یہاں تک آئے ہیں اور آپ نے ہمیں حوصلہ دیا اور آپ کے ساتھ مل کر عبادت کرنے سے بڑا مزہ آیا بہت لذّت ملی۔ بہت بہت شکریہ۔ مولا خداوند آپ سب عزیزوں کو سلامت رکھے اور کامیابی عطا فرمائے [آمین] ہر مشکل آسان ہو [آمین] اور آپ کو میدانِ علم میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی قوت اور صلاحیت عنایت فرمائے [آمین] اور سب مل کر امام کے لئے اور پیاری جماعت کے لئے علمی طور پر اعلیٰ سے اعلیٰ کام کر سکیں [آمین] اور اعلیٰ سے اعلیٰ علمی خدمات انجام دے سکیں، یہ آخری دعا ہے [آمین] شکریہ، بہت بہت مہربانی، یا علی مدد۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپنگ: نجمہ بیگ　　نظرِ ثانی: اکبر علی　　پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ؒ کا پُرحکمت بیان
عنوان: سورۂ بُروج (۸۵) کے تاویلی اسرار
از کتاب سوغاتِ دانش، صفحہ نمبر: ۸۵

کیسٹ نمبر: Q-16 تاریخ: ۳۰/ مارچ/ ۱۹۸۴ء کراچی

Click here for Audio

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یا علی مدد۔

میرے عزیزان! آج قرآنِ مقدّس کی تاویلات سے متعلق بہت ہی ضروری باتیں ہیں، ایک سوال کیا تھا اور یہ اُن کی کتنی بڑی مہربانی ہے کہ اِس ناچیز درویش سے رُجوع کیا، البتہ ہمارے سب عزیزان ایسا ہی کرتے ہیں کہ اِس بندۂ ناچیز کو تاویل سے متعلق اہمیت دیتے ہیں اور رُجوع کرتے ہیں۔ اُن عزیز نے ''سورۂ بروج'' کے بارے میں پوچھا تھا اور میں نے عاجزانہ گزارش کی تھی کہ ایک منظّم طریقے سے، یہ اُن کی اور دُوسرے عزیزوں کی خدمت میں پیش کرسکوں۔ بفضلِ مولا آج وہ تیار ہے، لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات توجّہ دیں اور میں خداوند کی یاری سے اِس کا آغاز کروں اور میرے نزدیک اِس کی بہت بڑی اہمیت ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ، برجوں والے آسمان کی قسم اور اُس دن کی قسم جس کا وعدہ کیا گیا ہے اور گواہ کی قسم اور اُس کی قسم جس کی گواہی دی گئی ہے (۸۵: ۱۔ ۳)۔ یہاں پر تین آیتیں پوری ہوتی ہیں یعنی عقلِ کُلی، نفسِ کُلی، ناطق اور اساس کی قسم۔ بروج کے معنی ہیں مضبوط قلعے، محلات نیز بارہ آسمانی برج اور برجوں والے آسمان سے عقلِ کُل مراد ہے کیونکہ اِسی کے وجودِ جوہری میں عقل و دانش اور علم وحکمت کے مستحکم قلعے، حسین وجمیل محلات اور حدودِ دین کے بارہ بروج موجود ہیں۔ بروج والے آسمان سے عقلِ کلی مراد لینے کے بعد کہا گیا ہے کہ عقلِ کلی اِس لئے بروج والا آسمان ہے کہ بروج کے ایک تو معنی قلعے ہیں اور محلات، نیز بارہ آسمانی برج ہیں۔ پھر اس کے ثبوت کے طور پر کہا گیا ہے کہ کیونکہ اِسی کے لطیف وجود میں عقل و دانش اور علم وحکمت کے مستحکم قلعے ہیں، نیز حسین وجمیل محلات ہیں اور حدودِ دین کے بارہ بروج موجود ہیں اور حدودِ دین کے بارہ بروج یہ ہیں مستجیب، چھوٹا ماذون، بڑا ماذون، داعیٔ مکفوف، داعیٔ مطلق، حجّتِ جزیرہ، حجّتِ اعظم (حجّتِ مقرب)، امام، اساس، ناطق، ثانی اور اوّل۔

یومِ موعود (وعدے کا دن) ثانی ہے، یعنی نفسِ کلی اِس لئے کہ وقت کا وجود ظاہراً اور باطناً اِسی سے بنا ہے یعنی وقت

نفسِ کلی سے پیدا ہوا ہے جیسے کہا گیا ہے یومِ موعود وعدے کا دن، تو اِس سے نفسِ کلی مراد ہے کیونکہ وقت اور دن، نیز قیامت سے نفسِ کلی مراد ہے کیونکہ وقت اِسی سے پیدا ہوا ہے۔ ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی وقت نفسِ کلی سے ہے اور نفسِ کلی وہ قیامت ہے جس کی ہستی آسمان و زمین پر محیط ہونے کی وجہ سے بھاری آرہی ہے (۷:۱۸۷)۔

اِس مقام پر میں مزید وضاحت کے طور پر ایک نکتے کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو قرآن نے یہ تصوّر دیا کہ قیامت کائنات پر بھاری آرہی ہے۔ خدا کا فرمانا حقیقت ہے یعنی اگر خدا کہتا ہے کہ قیامت ایک ایسی چیز ہے کہ آسمان اور زمین پر بھاری آگئی ہے، تو یہاں پر ہمیں سوچنا چاہئے کہ اِس میں کیا حقیقت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک دباؤ کی صورت میں ہے کہ نفسِ کلی نے اِس کائنات کو دبا رکھا ہے، گرفت کے طور پر، (hold) کے طور پر اِس پوری کائنات پر نفسِ کلی کا دباؤ پڑ رہا ہے اور اِسی حالت کو قرآن کی زبان میں کہا گیا کہ قیامت آسمانوں اور زمین پر بھاری آرہی ہے، تو یہاں قیامت سے مراد نفسِ کلی ہے جس نے پوری کائنات کو دبا کر رکھا ہے۔ اب اِس دباؤ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہر طرف سے اِس سخت گرفت کی وجہ سے اور اِس دباؤ کے سبب سے کائنات کے پیچوں پیچ جو مادّہ ہے جو جسم ہے وہ تحلیل ہو رہا ہے۔ تحلیل ہونے کے سبب سے ایک مخصوص حصّے میں جسم نور میں تبدیل ہو رہا ہے، گیس میں تبدیل ہو رہا ہے جس کو (helium gas) کہتے ہیں اور وہ سورج ہے، تو سورج اِس کائنات سے الگ تھلگ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ سورج کائنات کا وہ حصّہ ہے جہاں پر نفسِ کلی کے دباؤ سے لطیف جسم کی تحلیل ہو جاتی ہے یعنی جس طرح کسی ذرّے کو دبا کر دھماکہ بناتے ہیں ایک خاص طریقے سے، اِسی طرح سورج کے دائرے کے اندر جسم کا نہ صرف دھماکہ ہوتا ہے، بلکہ اِس میں سے تحلیل ہو کر روشنی پیدا ہوتی ہے، یہ جسم کی خاصیت ہے کہ اُس کو دبائیں یا جلائیں تو اُس میں سے روشنی پیدا ہوتی ہے، تو یہ ایک ثبوت ہے قرآن کا کہ نفسِ کلی اِس کائنات پر بھاری آرہا ہے اور وہی اِس کا بھاری پن قیامت ہے یعنی نفسِ کلی کی طاقت قیامت خیز ہے اور جس کا ثبوت سورج ہے، کہ اُس کے دباؤ سے سورج کی روشنی پیدا ہو رہی ہے۔

میں اِس کو دہراتا ہوں کہ تصوّر یہ ہے، کہ یہ کائنات گول شکل میں ہے کیونکہ اِس کائنات کے اندر ہر چیز کو جزوی طور پر دیکھتے ہیں کہ وہ گول ہے۔ لہٰذا اِس کائنات پر جو دباؤ پڑ رہا ہے وہ گولائی سے سینٹر کی طرف / مرکز کی طرف پڑ رہا ہے، اِس کو سائنسدان کششِ ثِقل کہتے ہیں۔ ہر کسی کا اپنا اپنا ایک محاورہ ہوتا ہے اور اپنی اپنی اصطلاح ہوتی ہے، تو اگر کچھ سیکنڈوں کے لئے سائنس کی بات مانیں تو وہ بھی یہی ہوگی کہ اِس کائنات سے کششِ ثِقل جو آرہی ہے وہ مرکز کی طرف آرہی ہے۔ زمین کی کششِ ثِقل زمین کے مرکز کی طرف اور پوری کائنات کی کششِ ثِقل وہ کائنات کے مرکز کی طرف، تو سورج کائنات کے وسط میں واقع ہے۔ پہلے کچھ حکماء اور (philosophers) کا یہ تصوّر تھا کہ یہ جو زمین ہے، سیّارۂ زمین، یہ کائنات کا مرکز ہے، لیکن بعد کے علوم نے یہ ثابت کر دیا کہ سیّارۂ زمین دُوسرے سیّاروں میں سے ایک سیّارہ ہے جو اِس کائنات کے ایک گوشے میں

گھوم رہا ہے یہ اِس کائنات کا سینٹر نہیں ہے، کائنات کا جو سینٹر ہے وہ سورج ہے۔

اب سورج ایک مخصوص دائرے میں روشن کیوں ہے، یعنی سورج اِس سے بڑا کیوں نہیں ہے یا اِس سے چھوٹا کیوں نہیں ہے، اِس کا اندازہ کہاں سے ہے کہ یہ اتنا بنا، یعنی اِس کا معیار کیا ہے، یہ کہ اِس کی ضخامت اور جسامت کا انحصار کائنات کی وسعت پر ہے کہ کائنات جتنی بڑی ہے اور اِس بڑی کائنات کو سنبھالنے کے لئے نفسِ کل نے جو کچھ دباؤ رکھا ہے اور جس طرح اُس نے اِس کو (hold) کیا ہے اُس کے نتیجے میں، اُس قوت کے مطابق ایک مخصوص دائرے کے اندر جسم کی تحلیل ہو کر (helium gas) کہئے یا نور کہئے یا مادّی روشنی کہئے، تو اُس صورت میں جسم/ایتھر تحلیل ہو رہی ہے، تو یہ تشریح اِس آیت کے تحت آگئی جس میں ارشاد ہے کہ قیامت اِس کائنات پر بھاری آرہی ہے، تو میں نے عرض کی کہ اِس سے نفسِ کلی کی طاقت مراد ہے اور اِس سورہ میں نفسِ کلی کے ناموں میں سے ایک نام ''یومِ موعود'' ہے، وعدے کا دن، تو تاویل کا یہ اُصول ہے کہ جہاں چار اصلِ دین کا ذکر آتا ہے یعنی عقلِ کلی، نفسِ کلی، ناطق اور اساس تو ہر ایک کی کوئی نہ کوئی مناسبت ہوا کرتی ہے، اُس مناسبت کے پیشِ نظر وہاں اُس حد کو بیان کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہاں عقلِ کلی کو بروج کا آسمان قرار دیا اور اِس کی مناسبت یہ ہے، کہ بروج سے محلات اور قلعے مراد ہیں، نیز بارہ بروج ہیں تو یہ ساری باتیں عقلِ کلی کے لئے صحیح ہیں۔ نفسِ کلی کے لئے وعدے کا دن کہا یعنی وہ قیامت جس کا لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے، تو پھر یہاں دوسرے حدود کو یا دوسرے اصل کو چھوڑ کو نفسِ کلی کو قیامت بیان کرنا یا قیامت قرار دینا اِس سبب سے ہے کہ نفسِ کلی بہت قیامت خیز طاقت رکھتا ہے اور جیسے اِس آیت میں یہ مثال بیان کی گئی کہ اُس کی طاقت اتنی ہے کہ وہ اِس کائنات پر بھاری آرہا ہے، بھاری آرہا ہے یعنی کہ اُس کا دباؤ ہے پوری کائنات پر۔

اِس کے بعد ناطق کی صفات میں سے ایک صفت یہاں پر یاد کی گئی کہ وہ شاہد ہے یعنی گواہ ہے اور بے شک ناطق یعنی آنحضرت ﷺ شاہد ہے یعنی گواہ ہے، تو کس طرح گواہ ہے وہ یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ شاہد یعنی گواہ ناطق ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمانِ اقدس ہے: اے نبیؐ! ہم نے تم کو گواہ اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور خدا کی طرف اُسی کے حکم سے بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے (۳۳: ۴۵۔۴۶)۔ یہ آیت کا ترجمہ ہے تو شاہد ناطق ہوئے یعنی آنحضرتؐ اور مشہود جس کی گواہی دی گئی ہے، مشہود کا مطلب جس کی گواہی دی گئی ہے سے اساس مراد ہے یعنی مرتضیٰ علیؑ۔ اب اِس کا کیا ثبوت ہے کہ مشہود کا جو لفظ ہے وہ مولا علیؑ کے لئے آیا ہے، اِس کا ثبوت یہ آیت ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اور اِسی طرح (اے ائمہ) ہم نے تم کو عادل اُمّت بنایا ہے تا کہ تم تمام لوگوں پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ بنے (۲: ۱۴۳)۔ عالمِ شیعیت میں یہ بات مشہور ہے کہ حضراتِ ائمہ اُمّت میں، مسلمانوں میں، اُمّتِ عادل ہیں۔ آپ کو شاید تعجب ہو کہ خدا نے کیوں اور کس معنیٰ میں اماموں کو عادل اُمّت کہا، اُمّت سے گروہ مراد ہے۔ آپ جب قرآن کی (study) میں جائیں گے،

تو آپ کے سامنے یہ بات آئے گی کہ ایک مقام پر خدانے ابراھیم کو جو فردِ واحد تھے، اُمّت کہا (۱۶:۱۲۰) یعنی ابراھیمؑ کی ذات میں جو ایک قوم ایک پوری قوم پوشیدہ تھی اور وہ بہت سے پیغمبروں کے اور اماموں کے باپ تھے اِس معنی میں خدانے ابراھیم علیہ السّلام کی پاکیزہ شخصیت کو ایک پوری اُمّت کے معنی میں لیا، تو پھر اِس میں کیا تعجب ہے کہ حضراتِ اَئمہ اُمّتِ عادل ہیں یعنی ایک عادل گروہ ہیں۔

اُس کے بعد: كَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (۲:۱۴۳)۔ اے اَئمہ ہم نے تم کو ایک عادل اُمت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ بنو۔ اب آپ دیکھتے ہیں کہ خدانے کس معنیٰ میں یہ ارشاد فرمایا کہ اے اَئمہ میں نے تم کو عادل اُمّت بنایا، ظاہر بات ہے کہ امام عادل ہوا کرتا ہے اور وہ لوگوں پر گواہ ہوا کرتا ہے، لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲:۱۴۳) تا کہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ بنے۔ رسول کی اماموں پر گواہی یہ کہ اُس نے بحکمِ خدا اماموں کو اپنا جانشین قرار دیا اور اُن کے گواہ بنے یعنی خدا کی طرف سے انہوں نے شہادت دی کہ یہی امام ہیں یعنی اساس مولاعلیؑ کو جو ابوالائمہ ہیں، اپنا جانشین قرار دیا اور اِس سلسلے میں رسولؐ نے کئی شہادتیں دیں اپنی احادیث میں، تو رسولؐ اماموں پر گواہ رہے اور اَئمہ لوگوں پر گواہ رہے کیونکہ اماموں کی رسائی ہے لوگوں کے ساتھ، کہ وہ ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں یعنی ہر زمانے میں ایک امام ہوا کرتا ہے اور اِس طرح امام کا مبارک وُجود ہر زمانے میں پایا جاتا ہے اور خدا کا درجہ بہت ہی بالا و برتر ہے۔ رسولِ اکرمؐ ایک مخصوص زمانے میں ظہور فرما تھے لیکن امامؑ کی شخصیت ایسی ہے کہ ہر زمانے میں لوگوں کے درمیان موجود ہوتی ہے اِس بنا پر لوگوں پر امام کا گواہ رہنا مناسب تھا قانونِ خداوندی کے مطابق، تو اِس معنیٰ میں رسولؐ شاہد یعنی حاضر کے معنی میں اور گواہ کے معنی میں شاہد کہلائے اور رسولؐ کی شہادت جن کے لئے تھی وہ مشہود کہلائے اور سب سے پہلے یہ مشہود علیؑ تھے، اور پھر یکے بعد دیگرے تمام حضراتِ اَئمہ مشہود ہیں، کہ اُن کی گواہی رسولِ اکرمؐ نے دی ہے، تو یہاں پر وہ تین مقدّس ہستیاں مذکور ہوئیں جن کی اللہ نے قسم کھائی ہے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اللہ کسی ایسی ویسی چیز کی قسم نہیں کھاتا ہے۔ انسان بھی جب قسم کھاتا ہے تو کسی ادنیٰ چیز کی قسم نہیں کھاتا ہے، جب بھی وہ قسم کھاتا ہے، تو اپنے سے اعلیٰ چیز کی قسم کھاتا ہے، بہت مقدّس چیز کی قسم کھاتا ہے، قرآن کی قسم کھاتا، خدا کی قسم کھاتا ہے، پیغمبر کی قسم کھاتا ہے، پیر کی قسم کھاتا ہے، کسی عظمت و بزرگی والی شیٔ کی قسم ضرور کھاتا ہے، ایمان کی قسم کھاتا ہے۔ لیکن اللہ سے برتر کوئی شیٔ نہیں ہے، لہٰذا خداوند، اپنے ماتحت چیزوں میں سے اُن چیزوں کو چنتا ہے قسم کے لئے، جو بہت ہی مقدّس ہیں اُس کی نگاہ میں اور وہ حدودِ دین ہیں۔ چنانچہ خداوندِ عالم نے عقلِ کلی کی قسم کھائی، نفسِ کلی کی قسم کھائی اور پھر ناطق کی قسم کھائی اور سب سے آخر میں اساس کی قسم کھائی، تو یہ اللہ کی چار قسمیں ترتیب وار ہیں اور سب سے آخر میں اساس کی قسم کھائی ہے، تو اِس سے مقصد کیا ہے؟ اِس سے مقصد یہ ہے کہ لوگ سمجھیں،

جانیں اور پہچانیں، کہ امامؑ کی اہمیت کیا ہے، امام کا مقام قرآن میں کیا ہے اور قرآن امام کے بارے میں کیا کہتا ہے، یہ مقصد ہے، تو آپ جانتے ہیں کہ اگر کسی سورے کے شروع میں یہ چار حدود ہیں اور جن کی عظمت و بزرگی کی اللہ نے قسم کھائی ہے، تو باقی جو سورہ میں جو کچھ بیان ہوتا ہے، تو وہ اُن ہی سے متعلق ہو جاتا ہے۔ جب اُن کا مقام یہ ہے کہ اللہ اُن کی عظمت و بزرگی کی قسم کھاتا ہے، تو باقی سورے میں جو کچھ بیان آتا ہے، تو وہ اُن سے متعلق ہو جاتا ہے اور وہ حق ثابت قرار پاتے ہیں اُن کا تصوّر صحیح ہوتا ہے۔

اب اس کے بعد خداوندِ عالم اِس قسم کے بعد ارشاد فرماتا ہے، مذکورۂ بالا قسم کے بعد ارشاد ہے کہ کفّار ہلاک ہوئے جس طرح خندق والے ہلاک کر دیئے گئے (۸۵:۴) یعنی ہلاکتِ رُوحانی سے تباہ ہو گئے۔ زمانۂ نبوّت سے پہلے عیسائی مومنین پر ایک ظالم بادشاہ نے کچھ ظلم کیا تھا اُن کو آگ سے بھری خندقوں میں ڈال کر جلانے کی کوشش کی گئی تھی، اِسی کو بیان کرتے ہوئے خداوندِ عالم ارشاد فرماتا ہے، کہ ہر زمانے میں یہ بات ہے، جسمانی طور پر نہ صحیح لیکن رُوحانی طور پر ہمیشہ کفّار مومنین کو ستاتے رہتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ آگ مادّیت میں سامنے ہو، کیونکہ حضرت ابراھیم علیہ السّلام کے قصّے میں جو ذکر آتا ہے کہ کافر بادشاہ نے حضرت ابراھیم صلوات اللہ علیہ کی ہستی کو جلانے کے لئے ایک آگ تیار کی تھی اور اُس آگ میں اِن کو پھینکا بھی تھا۔ منجنیق ایک آلہ ہوتا ہے جو کسی چیز کو پھینک دیتا ہے یہ جنگوں میں بھی پتّھر پھینکنے کے لئے استعمال ہوتا تھا، اِسی منجنیق پر حضرت ابراھیم کو بٹھا کر آگ میں پھینکا گیا تھا۔ لیکن اِس کی اصل جو حقیقت ہے وہ تاویل میں ہے، یہ کہ ابراھیمؑ کے لئے طرح طرح کی اذیتیں پیدا کی گئی تھیں اور اُن اذیتوں کا ایک رُوپ ہوا تھا جو آگ کی شکل میں تھا، تو یہ آگ حضرت ابراھیمؑ پر حملہ آور ہوئی تھی اور کچھ عرصے کے لئے حضرت ابراھیمؑ اُس رُوحانی آگ میں تھے لیکن خداوند نے اُس آگ سے فرمایا کہ: "كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ" (۶۹:۲۱) اے آگ! تو ٹھنڈی ہو جا اور گلستان بن جا، گلشن بن جا، تو وہ آگ گلشن میں تبدیل ہو گئی۔ اصل میں یہ آگ رُوحانی قسم کی تھی اور وہ رُوحانی آگ گلشن میں بدل گئی تھی، تائید میں بدل گئی تھی، تائیدات میں بدل گئی تھی، اصل جو صحیح رُوحانیت ہے اُس میں بدل گئی تھی، تو جب بھی کوئی کامل انسان رُوحانیت کے مراحل سے گزرتا ہوتا ہے، تو اُس وقت [تک] اُس کی رُوحانیت مکمل نہیں ہوتی ہے جب تک کہ وہ مخالفتوں سے نہیں گزرتا ہے، اور اُس کے سامنے کوئی آگ نہیں آتی ہے، مخالفتوں اور اذیتوں کی ایک آگ۔ اِس کے بغیر کوئی بھی کامل انسان گھر میں بیٹھے بٹھائے، کسی تکلیف کے بغیر، کسی مخالفت کے بغیر، کسی ظاہری باطنی دشمنی کے بغیر رُوحانیت کے مراحل سے نہیں گزرتا ہے، اور خداوندِ عالم نے یہ قانون بنایا ہے جس طرح شب و روز ہیں اور (positive negative) ہے ہر چیز میں تو اِسی طرح دوستی اور دشمنی کے (combination) سے ایک رُوحانیت بنتی ہے، دشمنی سے مراد تکلیف اور دوستی سے مراد خدا کی محبّت، اور اِس لئے حدیث ہے کہ: "اَلَّذِيْنَ لَهُمْ حُبٌّ لِلّٰهِ وَ بُغْضٌ لِلّٰهِ" [مطلوب المومنین، صفحہ:۴۱] خدا ہی کے لئے دوستی کی جاتی ہے اور خدا ہی کے لئے دشمنی خریدی جاتی ہے، تو یہ آگ جو کفّار نے

تیار کی تھی اور جس سے مومنین کو اذّیت دی گئی تھی ہمیشہ اور ہر زمانے میں ہوتی ہے، کہ کفّار ہلاک ہوئے جس طرح خندق والے ہلاک کر دئے گئے یعنی ہلاکت رُوحانی سے تباہ ہو گئے (۴:۸۵)، کہ آگ بہت ایندھن والی تھی (۵:۸۵)، جس وقت وہ لوگ اُس آگ کے آس پاس بیٹھے تھے یعنی شر انگیزی اور فتنہ پردازی میں مصروف تھے (۶:۸۵) اور جو سلوک اہلِ ایمان کے ساتھ کرتے تھے اُس کو سامنے سے دیکھ رہے تھے (۷:۸۵) اور اُن کافروں نے اِن مومنین میں کوئی عیب نہیں پایا بجز اِس کے کہ یہ خدا پر ایمان لے آئے تھے جو غالب اور سزاوارِ حمد ہے (۸:۸۵) تو خدا جس کی ساری زمین و آسمان میں بادشاہت ہے (۹:۸۵)۔

یہاں پر اِس سلسلے میں یہ ذکر کیوں آیا کہ آسمان اور زمین میں خدا کی بادشاہی ہے۔ اِس ذکر کی مناسبت یہ ہے کہ جو مومنین ستائے جاتے ہیں جن کو تکلیف دی جاتی ہے اُن کو بہشت کے عنوان سے خدا کی سلطنت ملتی ہے۔ ہم نے کبھی اِس پر گفتگو کی تھی اور لکھا بھی تھا اور اب میں یہ مسئلہ اُٹھانا چاہتا ہوں کہ بہشت اور خدا کی سلطنت یہ دو چیزیں الگ الگ ہیں یا کہ ایک ہی حقیقت کے یہ دو نام ہیں۔ اگر خدا کی سلطنت الگ ہوتی اور بہشت اِس سے جدا کوئی جگہ ہوتی تو اِس کا مطلب یہ ہوتا کہ خدا نے بہت ساری چیزیں بہشت سے الگ رکھی ہیں جو بہشت والوں کو دینا نہیں چاہتا ہے، اور دُوسری بات یہ ہوتی کہ بہشت میں ہر وہ چیز ملتی ہے یہ آیت (۳۱:۱۶) ہے تو پھر یہ بات صحیح نہیں ہوتی ہے کیونکہ اِس تصور کے مطابق کہ اگر بہشت الگ ہے اور خدا کی سلطنت الگ ہے تو کوئی جنّتی ایک ایسی چیز کو چاہتا ہے جو کہ وہ صرف خدا کی بادشاہی میں پائی جاتی ہے اور وہ اُس کو نہیں مل رہی ہے تو پھر اُدھر سے یہ جو کلیّہ ہے کہ بہشت میں ہر چیز مل جاتی ہے جو بھی وہ چاہتے ہیں (۳۱:۱۶) تو یہ کلیہ کیسے درست ہو سکتا ہے۔ اِس منطق سے یہ ظاہر ہے کہ جو خدا کی بادشاہی ہے وہی بہشت ہے اور جو بہشت ہے وہ خدا کی بادشاہی ہے۔ لیکن ایک حقیقت کے بہت سے نام ہوا کرتے ہیں پھر جب خدا اپنی حکمت کے مطابق، اپنے منشاء کے مطابق اُس حقیقت کا کوئی بھی نام لے سکتا ہے، جیسے ابھی ابھی آپ کے سامنے عقلِ کُلی کے، نفسِ کُلی کے، ناطق کے اور اساس کے (code words) بتائے گئے، اُن کے مخفی نام، اِس طرح آسمان زمین کی سلطنت سے مراد بہشت ہے کیونکہ قرآن میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جنّت کا طول وعرض بھی اتنا ہے جتنا کہ اِس کائنات کا (۱۳۳:۳)۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ یہی کائنات اپنی اندرونی کیفیت میں لطیف جسم میں، رُوح میں اور عقل میں بہشت ہے، یعنی اِس کائنات کی ایک آسٹرل باڈی بھی ہے، جس طرح ہم کہتے ہیں کہ ہر انسان کا ایک جثۂ ابداعیہ ہے، ایک آسٹرل باڈی ہے، کوکبی بدن ہے، اِس طرح اِس کائنات کی بھی ایک باڈی ہے، ایک جسم ہے، وہ ایتھر کا ہے، فلکی ہے، کوکبی ہے، لطیف ہے اور ابداعی ہے، وہ ہی بہشت ہے۔ بہشت میں تین چیزیں ہیں لطیف جسم ہے، قدسی رُوح ہے، کامل عقل ہے اور انسان بھی اِن ہی تین چیزوں سے بنا ہوا ہے، کہ انسان کا ایک کثیف جسم ہے، ایک چھوٹی سے عقل ہے، ایک چھوٹی سی رُوح ہے اور پھر ایک

چھوٹی سی عقل ہے، انسان اِس وقت ناقص ہے، جزوی ہے، کمتر ہے، ناپختہ ہے یا کچّا ہے اس لئے اِس کا کثیف جسم ہے اور ایک جزوی رُوح ہے اور جزوی عقل ہے اور جب یہ بہشت میں داخل ہو جائے گا تو اِس کو کلی بنانے کے لئے لطیف جسم سے اس کو اِستفادہ کرایا جائے گا اور کلی رُوح سے اور کلی عقل سے۔

بہشت کی بات تھی یہ جاننا ہمارے لئے بہت ہی ضروری ہے کہ بہشت اِس کائنات میں پھیلی ہوئی ہے لیکن ایک اور چیز ہے یہ کہ بہشت کی دو حالتیں ہیں۔کُل قرآن کے مطالعہ سے یہ خلاصہ ملتا ہے کہ بہشت کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ اِس کائنات میں پھیلی ہوئی ہے، ایک یہ کہ وہ نزدیک سے نزدیک ہے۔خدا کی حکمت بڑی عجیب ہے کہ اُس نے اپنی عزیز کتاب میں ارشاد فرمایا ہے کہ ایک دن وہ اِس پوری کائنات کو اپنی مٹھی میں لے لے گا (۳۹:۶۷)۔اِس سے ہوشمند جانتا ہے کہ خدا کے اِن آسمانوں اور زمین کو مٹھی میں لینے سے کیا مراد ہے۔اِس سے یہ مراد ہے کہ خدا یہ بتانا چاہتا ہے کہ بہشت جہاں اِس کائنات میں پھیلی ہوئی ہے وہ خدا کی مٹھی میں یکجا ہے ایک گوہر کی طرح، ایک سَت کی طرح، ایک رُوح کی طرح یکجا ہے۔ جہاں دُنیا والے پورے ایک گلشن کو نچوڑ کر (essence) بناتے ہیں عطر بناتے ہیں، گویا ایک شیشی کے اندر پھولوں کے ایک بڑے ذخیرے کو سمو لیتے ہیں، تو اِس طرح خداوندِ عالم نے گوہرِ عقل میں بہشت کو سمو لیا ہے، تو یہ معنی ہیں جو خداوندِ عالم فرماتا ہے کہ ایک دن خداوندِ عالم اِس کائنات کو اپنے قبضۂ قدرت میں سمیٹ لے گا، تو بہشت کی یہ دو کیفیتیں بیان ہوئیں، ایک یہ کہ بہشت ہر جگہ پر ہے اور دوسرا یہ کہ بہشت بس نورِ عقل میں ہے، عقل کا ایک نور ہے اُس میں بہشت ہے۔یہ خدا کی ذات ہے کہ وہ کسی چیز کو پھیلاتا ہے پھر اُس کو سمیٹتا ہے اور یہ خدا کے قانون میں سے ہے، آپ جہاں بھی جائیں گے اِس قانون کو دیکھیں گے، کہ ہمیشہ چیز ایک طرف سے پھیل جاتی ہے اور دُوسری طرف سے سمٹ جاتی ہے۔درخت کو لیجئے کہ بیج میں سمٹا ہوا ہوتا ہے، جب بیج کو بو دیتے ہیں زمین میں تو پھر آہستہ آہستہ وہ درخت پھیل جاتا ہے، پھیل جانے کے بعد پھر وہ اپنی عادت کے مطابق، اپنے قانون کے مطابق وہ سمٹ جاتا ہے یعنی اُس میں سے جو پھل ہوتا ہے اور پھل میں جو بیج ہوتا ہے تو اُس بیج میں پھر وہ سمٹ جاتا ہے پھر اِس بیج کو آپ بو دیں زمین میں پھر وہ پھیل جاتا ہے پھر اُس درخت میں سے جو بیج پیدا ہوتا ہے پھر سمٹ جاتا ہے، اور اِسی سے لاانتہائی بن جاتی ہے۔آدمی بھی ایسا ہوتا ہے، آدمی بھی کسی بیج سے درخت کی طرح پیدا ہوا ہے، اور پھر آخر میں اُس میں وہ بیج پیدا ہو جاتا ہے۔

اِس کائنات کو ایک گوہر سے پیدا کیا گیا، اِس کائنات کو ایک موتی سے پیدا کیا گیا یعنی دین کی بڑی بڑی کتابوں کو اور بزرگانِ دین کے اقوال کو، گنانوں کو سامنے رکھنے سے پتا چلتا ہے، کہ اِس کائنات کو خداوندِ عالم نے ایک موتی سے پیدا کیا، ایک موتی سے پیدا کیا تو: ''کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ'' کے بموجب ہر چیز اپنی اصل کی طرف رُجوع کرتی ہے یہ حدیث ہے، تو حدیث جو صحیح ہے وہ قانون ہوا کرتی ہے اور اُصول کا درجہ رکھتی ہے۔لہٰذا یہ قانون ہے کہ اگر اِس کائنات کو

ایک موتی سے پیدا کیا گیا ہے، تو پھر اس کو آخر کار ایک موتی بن جانا چاہئے اور قرآن میں یہی ذکر ہے کہ خداوندِ عالم اِس کائنات کو جب ہاتھ میں لیتا ہے، تو اِس کو موتی بنا لیتا ہے۔ ہمارے مقالوں میں یہ آیتیں آپ کے سامنے کئی بار آچکی ہیں اور ہمارے جو باقاعدہ (regular study) کرنے والے جو ہمارے عزیزان ہیں اُن کو اِس میں کوئی اُلجھن نہیں ہے۔ چنانچہ بہشت کی بات تھی کہ بہشت کی دو کیفیتیں ہیں کہ وہ ہر جگہ پر ہے اور وہ نورِ عقل میں ہے۔ دونوں باتیں صحیح ہیں کہ اگر بہشت کائنات میں ہوتی تو پھر مادّی طور پر اِس [سے] کسی بھی مومن کو پرواز کرنا چاہئے، اِدھر جانا چاہئے، اُدھر جانا چاہئے، ایک نعمت کے پیچھے چلے جائیں تو دوسری بہت ساری نعمتیں پس پشت رہ جائیں اور چھوٹ جائیں، کہاں جائیں کس طرف دیکھیں، کیا کریں، یہ بات صحیح نہیں ہے، لہٰذا خداوندِ عالم نے تمام نعمتوں کو نور میں سمیٹ لیا۔ ”اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ“ (۲۴:۳۵)۔ اِس کے بہت سے معنی ہیں لیکن بڑے معنی اِس کے دو ہیں۔ اِس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ اِس کائنات کو اِسی طرح اپنی شکل میں چھوڑیں اور پھر خدا ایک (disperse) نور ہے ایک یہ ہے۔ دُوسرے معنی اِس کے یہ ہیں کہ اِس کائنات کو نچوڑیں یا اِس کو جلائیں تو جو روشنی پیدا ہوگی وہ اللہ کی روشنی ہوگی، ایک معنی اِس کے یہ ہیں۔ دونوں معنی اِس آیت کے اندر ہیں۔ ایک معنی تو آپ نے سمجھ لیا ہے اور اِس کا تصور بھی کیا ہے، تجزیہ بھی کیا ہے، غور و فکر بھی کیا ہے اور دُوسرے معنی کے بارے میں آپ نے نہیں سوچا ہے جو میں ابھی بتاتا ہوں۔ اِس پوری کائنات کو، آدمیوں کو ہر چیز کو جلاؤ جو روشنی پیدا ہوگی وہ اللہ کا نور ہے۔ اگر آپ اِس کو نہیں جلاتے ہیں تو اِس کو نچوڑو اِس کائنات کو نچوڑو جو تیل اِس میں سے نکلے گا اُس میں آگ لگائیں پھر جو روشنی ہوگی وہ اللہ کا نور ہے۔ آیت کے اندر بھی ایسا کہا ہے کہ جو درختِ زیتون ہے وہ نہ تو مشرق کا ہے اور نہ مغرب کا ہے، اِس معنیٰ میں اگر پوری کائنات کو لیتے ہیں تو نہ مشرق رہتا ہے، نہ مغرب رہتا ہے، نہ شمال میں رہتا ہے، نہ جنوب، اِس کی حدود ختم ہو جاتی ہیں، اِس کے یہی ایک معنی نہیں ہیں۔ میں نے پہلے ہی عرض کی ہے، کہ اِس کی کئی تاویلیں ہیں اور ہم اپنے عزیزوں کے ساتھ اِس کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں لیکن ایک تاویل جو ابھی تک میں نے آپ کو نہیں بتائی تھی یہ، کہ اِس کائنات کو آپ نچوڑیں اِسی کو درختِ زیتون قرار دیں پوری کائنات کو، اِس میں کوئی اچھی چیز ہے، بُری چیز ہے کوئی بات نہیں ہے، تمام کائنات کو نچوڑیں اِس سے جو ست نکلے گا یا جو تیل پیدا ہوگا اُس میں آگ لگائیں اُس میں سے جو روشنی پیدا ہوگی وہ اللہ کا نور ہے یا اِس کائنات کو آگ لگائیں، اِس کو جلائیں جو روشنی نکلے گی وہ اللہ کا نور ہے۔

آپ آگ لگانے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، چلئے اِس کو ایک درخت مانیں درختِ زیتون مانیں اِس پوری کائنات کے درخت سے جو میوہ بنتا ہے اور اُس میں جو بیج ہے اور اُس میں جو تیل ہے وہ اللہ کا نور ہے۔ انفرادی طور پر اِس میں اجتماعیت کی کوئی بات نہیں ہے، اگر آپ تیار ہیں، تو اِس وقت آپ کے لئے اللہ اِس کائنات کو نچوڑے گا اِس کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہیں ہے جیسے لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ کوئی خاص وقت ایسا آئے گا جس میں اللہ اِس پوری

کائنات کو اپنی مٹھی میں لے لے گا(٣٩:٦٧) تو کیا ابھی نہیں لیا ہے ابھی کس نے اِس کو پکڑا ہے؟ اِس کی تاویل ہے، تاویل یہ ہے، کہ آپ جب رُوحانیت کے اعلیٰ مراحل میں سے گزرتے جائیں گے، تو اِس کائنات کے اپنی جگہ پر قائم ہوتے ہوئے آپ یہ معجزہ دیکھیں گے، یہ کرشمہ دیکھیں گے کہ خداوند اِس کائنات کو اپنی مٹھی میں لے لے گا۔ جو چیز خداوند اپنے ہاتھ میں آپ کو دکھائے گا وہ یہی کائنات ہوگی اور قرآن اِس کی تصدیق کرتا ہے۔ جو چیز خداوند کے دستِ مبارک میں ہوگی اُس کی قدریں، اُس کی (values) اِس کائنات کے برابر ہوگی، تو اِسی میں بہشت بھی آئے گی، اِسی میں خدا کی بادشاہی بھی آئے گی اور ہر چیز آئے گی۔ کائنات میں دونوں جہاں میں جو کچھ ہے وہ سب اِسی چیز میں آئے گا جو دستِ راست میں ہے۔ یہ بہشت کی بات ہے اور بہشت کی بات ضرور کرنی چاہیئے کیونکہ یہاں مومنین کے لئے تکالیف آنے کی بات ہے، کہ ہر مومن کو جو بڑے پیمانے پر رُوحانی ترقّی کرنا چاہتا ہے، آگاہ رہنا چاہیئے کہ دُنیا میں تکالیف آتی رہتی ہیں اور اُس میں بڑی رحمت ہے بڑی رحمت ہے اور دیکھئے کہ خداوندِ عالم نے پانچ دروازے بنائے ہیں جو رُوحانیت کی طرف جانے اور رُوحانیت میں داخل ہونے کے لئے مقرر ہیں۔ پہلا دروازہ اِس کا یہ ہے: "وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ" (٢:١٥٥) خوف کا ہے دروازہ، ظالم سے خوف، دشمن سے خوف یا کسی اور چیز سے خوف "وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ" فاقہ، تقویٰ، روزہ، بھوک۔ یہ نہیں معلوم کہ آپ کس بھوک کو اختیار کرتے ہیں، یہ بھی اِس سلسلے کا ایک دروازہ ہے۔ "وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ" مال کا نقصان، یہ تیسرا دروازہ ہے، یکا یک آپ کے مال میں نقصان ہوگیا یا شروع ہی سے آپ نقصان میں ہیں یا درمیان میں نقصان ہوگیا۔ "وَالْاَنْفُسِ" جان کا نقصان، کسی عزیز کی موت، [ناگہانی] باپ کی موت، ماں کی، بھائی کی، بہن کی، بیٹے کی، بیٹی کی اور (wife) کی، یہ ایک دروازہ ہے، تو اِس کے لئے غم نہیں کرنا چاہیئے۔ "وَالثَّمَرَاتِ" پانچواں دروازہ ہے، پھلوں کا نقصان، پھلوں کا نقصان سے مراد یہ ہے کہ آپ محسوس کرتے ہیں کہ علمی طور پر آپ بھوکے ہیں اور آپ شدّت سے احساس اپنے اندر پیدا کرتے ہیں تو یہ سعادت ہے۔ یہ پانچ دروازے ہیں اِن سے رُوحانیت میں رحمت میں داخل ہوجایا جاتا ہے۔ میں پوری آیت پڑھ کر سناتا ہوں: "وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْآ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَّاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ" (٢:١٥٥۔١٥٧)۔

صبر اِسی سے متعلق ہے جب اِن پانچ مصیبتوں سے کوئی بھی مصیبت نہیں ہے، تو صبر جو پیغمبرانہ صفت ہے جو ایک پیغمبرانہ صفت ہے، وہ نہیں بنتا ہے اُس کا وجود نہیں بنتا ہے۔ اِن مصیبتوں میں سے ایک یا ایک سے زیادہ مصیبتیں جب تک نہیں آتی ہیں تو صبر کا وجود نہیں بنتا ہے اور صبر کے بغیر رُوحانیت نہیں بنتی ہے، جب اِن مصیبتوں میں سے صبر بنتا

ہے اور پھر صبر کیا جاتا ہے، تو اُس کو خوشخبری ملتی ہے ۔ خوشخبری کیا صرف قرآن میں ہے؟ کیسے پتا چلے کہ قرآن میں کوئی خوشخبری ہے تو وہ میرے لئے ہے یا کسی اور کے لئے ہے ۔ خوشخبری اپنی ذات میں ملتی ہے، جب رُوحانیت کی روشنی آتی ہے، تو یہ خوشخبری ہے، جب دل کی آنکھ کھل جاتی ہے، تو یہ خوشخبری ہے، تو یہ خوشخبری پیغمبر کی طرف سے ہے اور پیغمبر کے جانشین کی طرف سے ہے، کیونکہ اِس آیت میں خوشخبری دینے کی ذمہ داری، اور ڈرانے کی ذمہ داری آنحضرتؐ کو سونپی گئی ہے اور آنحضرتؐ اپنے جانشین کے توسّط سے اِن تمام کاموں کو انجام دینے کے لئے جن کا ذکر آنحضرتؐ سے متعلق ملتا ہے، یعنی آپ کو قرآن میں ایسے بہت سے کام ملیں گے، کہ اُن سے آپ سمجھیں گے کہ پیغمبر کو دُنیا میں ہونا چاہئے، مثلاً: ’’خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ ‘‘(۹:۱۰۳) اے رسول! اُن کے اموال سے ایک صدقہ کو لیجئے تا کہ اِس کے ذریعے سے آپ اُن کو پاک کریں، پاکیزہ کریں۔ ’’وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ‘‘(۹:۱۰۳) دُعا کیجئے کیونکہ آپ کی دُعا میں اُن کے لئے تسکین ہے، تو کیا یہ زمانۂ نبوّت سے متعلق ہو سکتا ہے یہ حکم، اور پھر بعد کے لوگ اِس سے محروم ہو سکتے ہیں، نہیں! آنحضرتؐ کا جو جانشین ہے دنیا میں وہ حضورؐ کے اِس کام کو انجام دیتا ہے، مثلاً بیعت کی آیت کو پڑھئے کہ کتنی اہمیت ہے اور اُن مومنین کو کتنی بڑی فضیلت ہے جو حضورؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کرتے تھے یا جنہوں نے بیعت کیا لیکن ہم مانتے ہیں کہ حضورؐ کے جانشین کے دستِ مبارک پر بیعت کرنا خود حضورؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کرنا ہے ۔ یہ دو باتیں نہیں ہیں، بہت سی چیزیں ہیں، بہت سے امور ہیں، بہت سے کام ہیں قرآن میں جو رسولؐ سے متعلق ہیں ۔ یعنی جن کا ذکر اِس طرح سے ہے، کہ اے رسولؐ یہ کام کیجئے، یہ کام کیجئے اور مومنین سے یوں فرما دیجئے، تو اِس کے لئے ایک طرح کی رسولؐ کی حیثیت اُن کا نور ہمارے درمیان موجود ہونا چاہئے اور ہے اور اِس سلسلے میں آپ کو یہ تحریری صورت میں یہ مقالہ ملے گا تو یہ سوالات تھے، اور ہمارے ایک عزیز نے کیے تھے کل کی محفل میں، اور اِس سلسلے میں یہ چھوٹا سا مقالہ یا چھوٹی سی تحریر آپ کے سامنے ہے ۔ میں بعد میں آپ کو اِس کی کاپیاں دے دوں گا، اور اب میں آپ کے کسی سوال کے لئے وقت کو بچاتا ہوں اور اپنی اس گفتگو کو ختم کرنا چاہتا ہوں، شکریہ کہ آپ نے شوق سے سنا اور انہماک سے توجّہ دی ۔ بہت مہربانی اور بہت شکریہ ۔ یا علی مدد ۔

سوال: (حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ جو واقعات گزرے تھے اُن کا تعلق صرف رُوحانیت سے تھا یا اُنکا تعلق ظاہریت سے بھی تھا؟ اِس حوالے سے کچھ وضاحت کیجئے) ۔

جواب: ہاں! آپ کا سوال عمدہ ہے، یہ کہ پیغمبروں کے اکثر واقعات جو متشابہات کے طور پر ہیں، وہ سب کے سب اپنا ایک تاویلی پس منظر رکھتے ہیں ۔ اِسی طرح حضرت ابراہیمؑ کو آپ کے دشمنوں نے رُوحانی آگ میں ڈالا تھا اور وہ آگ خدا کے حکم سے رُوحانیت کا گلشن بن گئی تھی (۲۱:۶۹) ۔ یہ ایک تاویلی حقیقت ہے، اور اِسی طرح حضرت آدمؑ سے

شروع کر کے بہت سارے واقعات رُوحانی تھے، حضرت نوحؑ کا طوفان ایک رُوحانی واقعہ تھا، اور اِسی طرح حضرت ابراھیمؑ کے بعد حضرت موسیٰؑ کے بہت سے واقعات، حضرت عیسیٰؑ کے بہت سے واقعات، علیٰ ھذا القیاس، مثلاً حضرت عیسیٰؑ کے لئے جو دسترخوان آسمان سے نازل ہوا تھا وہ مادّی غذاؤں کا دسترخوان نہیں تھا، بلکہ وہ رُوحانیت کا علم وحکمت کا دسترخوان تھا۔ کیونکہ آپ دیکھتے ہیں کہ ایسے باہوش لوگ جن کو یہ توفیق ملی تھی کہ حضرت عیسیٰؑ کو پہچانیں اور اُس کے لئے مرید بنیں، شاگرد بنیں، یہ کیسے سوال کر سکتے تھے، کہ اُن کو ایک وقت کا کھانا مل جائے، بلکہ یہ جو آسمانی دسترخوان تھا وہ رُوحانیت کا اور علم وحکمت کا تھا، اور اسماعیلی تاویلات کی کتابوں میں ایسا ہی ذکر ہے۔ چنانچہ آپ کے سوال کے مطابق کہنا ہے کہ حضرت ابراھیمؑ کا گزر جس آگ سے ہوا تھا وہ آگ دشمنوں کی بدخواہی، بُرائی، اذّیت وغیرہ تھی۔

اب میں اِس کو یہاں چھوڑ کر ایک دوسری آیت کی طرف رُجوع کر کے آپ کو توجّہ دلانا چاہتا ہوں کہ: "وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ" (۵:۱۱۳) تو یہاں پر حسد کرنے والے کے حسد سے پناہ طلب کی گئی ہے۔ اِس سلسلے میں ہمیں جاننا چاہئے کہ حسد کیا ہے؟ حسد کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو مادّی طور پر ہم کو ظاہراً کوئی اذّیت پہنچائے، یہ اندر اندر کی جلن ہے اور رَشک سے بڑھ کر ایک معنی ہے، کہ آپ کی ترقّی کو دیکھ کے کوئی شخص دل میں جلتا ہے یہ تو اُس کی ایک قلبی کیفیت ہوگئی، بھلا اِس کی کیا ضرورت تھی کہ ہم ایسے میں بھی خدا کی پناہ میں رہیں، تو کوئی جلتا ہے تو جلنے دینا چاہئے تھا لیکن خدا نے یہ تعلیم کیوں دی کہ ہم ایسے میں بھی خود کو خدا کی حفاظت میں رکھیں، خدا سے پناہ طلب کریں، خدا کے حضور میں خود کو محفوظ رکھیں، نہیں تو وہ حسد ہم کو اذّیت دے رہا ہے، اُس کے ہم کو اذّیت دینے کا، نقصان پہنچانے کا اندیشہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُس کے حسد کو راستہ ملتا ہے ہماری طرف آنے کا اور وہ آتا ہے، وہ ہم کو نقصان پہنچاتا ہے، رُوحانی کیفیت میں آتا ہے ظاہراً کچھ نہیں ہے، تو یہ معوّذتین [سورۂ فلق (۱۱۳) اور سورۂ ناس (۱۱۴)] دو سورے ہیں اُن میں آپ دیکھیں کہ اُن میں جو کچھ شر کا ذکر ہے ہر قسم کے شر کا ذکر ہے، جادو کا بھی ذکر ہے، حسد کا بھی ذکر ہے اور اِس کے علاوہ بھی طرح طرح کے بُرے خیالات اور وسوسوں کا بھی ذکر ہے، تو وسوسہ کیوں آتا ہے؟ آپ باور کریں گے کہ مشرق میں آپ کا کوئی دینی دشمن ہے وہ آپ کے خلاف بُرائی چاہتا ہے، تو یہ اُس کی بُرائی آپ کے اندر وسوسہ کی شکل میں پہنچ جائے گی۔ کوئی حسد کرتا ہے، تو وہ رُوحانی شکل میں آئے گی، دشمنی ہے تو اُس کا اثر ہوگا۔ اِسی طرح حضرت ابراھیمؑ سے جو لوگوں نے دشمنی کی تھی، تو اُس دشمنی کو اور اُس اذّیت کو خدا نے رُوحانی طور پر موقع دیا تھا اور ہمیشہ ایسا ہوتا ہے۔ اِس موقع دینے میں بڑی حکمت ہے، شیطان کے وسوسے کو خدا موقع دیتا ہے وہ چاہتا تو کوئی (barrier) رکھ کر اُس کو وہیں روک دیتا، ایسا نہیں کرتا ہے۔ اُس کو آپ کی طرف آنے دیتا ہے، اُس کے آنے میں بڑی حکمت ہے، آپ جدوجہد کرتے ہیں آپ جہاد کرتے ہیں اور کبھی کبھار آپ اُس کی زد میں آتے ہیں لیکن اِس (struggle) کے بعد آپ کی زندگی بنتی ہے، رُوحانیت بنتی ہے، ہمّت پیدا ہوتی

ہے، خدا کو رحم آتا ہے اور پھر دشمن کو زوال دیتا ہے، یہ خدا کے قانون کو، خدا کے عدل کو، خدا کے انتقام لینے کے اُصول کو موقع ملتا ہے اور اِسی طرح خدا کی خدائی چلتی ہے۔

ایک آیت ہے وہ یہ ہے، کہ اُس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جو بُری سفارش کرتا ہے، تو اُس سے ایک حصّہ اِس کو واپس آئے گا اور جو اچھی سفارش کرتا ہے، تو اِس سے بھی ایک حصّہ اِس کو واپس آئے گا، باقی اُس طرف جائے گا جس کی یہ بُری سفارش کرتا ہے یا اچھی سفارش کرتا ہے، تو یہ اُس کی طرف جائے گا (۴:۸۵)۔ مطلب اِس کا یہ ہے کہ دُعا ہے، دعا جائے گی، دعا ایک رُوحانی چیز ہے اتنی اہمیت کیوں ہے اگر دُعا نہیں جا سکتی ہے مشرق کو نہیں جا سکتی ہے، مغرب کو نہیں جا سکتی ہے، تو دُعا کے لئے خود خدا نے فرمایا ہے (۴۰:۶۰) یہ کوئی انسانی تجویز نہیں ہے، تو اِسی طرح اچھی چیزیں اور بُری چیزیں رُوحانی طور پر آزاد ہیں، آتی جاتی ہیں، تو ابراھیمؑ کے زمانے میں جو دشمنیاں تھیں اور جو حسد تھا اور جو دین کے دشمنوں کی طرف سے بُرائی تھی وہ سب مل کر ایک آگ کی شکل میں آ گئی تھی، اور وہی آگ تھی، اُسی کو خدا نے کہا کہ ٹھنڈی ہو جا اور اُسی سے کہا کہ تو ابراھیمؑ کے لئے سلامتی بن جا (۲۱:۶۹)۔ پہلے تو وہ آگ تھی پھر وہ ٹھنڈی ہو گئی اور آگ نے خدا کے حکم سے گلشن کی شکل اختیار کی، تو یہ ہے آپ کے سوال کا جواب۔

سوال نمبر: [(امین رحمانی) سر! آپ نے فرمایا کہ نفسِ کُل سے ظاہراً و باطناً وقت بنتا ہے وقت کا وُجود ظاہراً اور باطناً نفسِ کُلی سے ہے، ظاہراً میں اگر وقت کہیں تو شاید اِس طرح سے ہو گا کہ اُس نے اِس کائنات کو پیدا کیا تو یہ وقت کا چکّر شروع ہوا، لیکن باطناً کس طرح سے ہو گا؟ اِس کی کچھ وضاحت فرمائیں)۔

جواب: عمدہ سوال ہے، شکریہ، نفسِ کُلی سے ظاہراً اور باطناً وقت کا وُجود اِس طرح سے ہے کہ وقت دو قسم کا ہے، ایک وقت اِس کائنات سے وابستہ ہے اور یہ کائنات اِس وقت کو ظاہر کرتا ہے۔ دُوسرا وقت وہ ہے جو ساکن ہے ٹھہرا ہوا ہے جس کو دھر کہتے ہیں، وہ رُوحانیت کا وقت ہے۔ اگر آپ اِس کائنات کو اُٹھائیں گے آسمان، زمین اور سورج، چاند، ستاروں کو تو اُس وقت دُنیا کا وقت نہیں ہو گا، اُس حالت میں دُنیا کا وقت نہیں ہو گا بلکہ وہ ایک ٹھہرا ہوا وقت ہو گا، گزرنے والا وقت نہیں ہو گا۔ یہ ٹھہرا ہوا وقت کیا ہے؟ وقتِ ناگزرندہ، دھر جس کو کہتے ہیں، اٹل وقت کہ اُس کی صبح نہیں ہے، دوپہر نہیں ہے، شام نہیں ہے، دن نہیں ہے، رات نہیں ہے، ماضی نہیں ہے، مستقبل نہیں ہے، بس حال ہی حال ہے ایسا وقت یا یہ کہ وہ ایک ایسا وقت ہے کہ اُس کے تحت حال بھی ہے، مستقبل بھی ہے اور ماضی بھی ہے اور جب آپ اِس کائنات کو رکھیں گے یعنی فرضی طور پر، تو اُس وقت یہ ظاہری وقت ہو گا، تو یہ دونوں وقت نفسِ کلی سے ہیں کیونکہ وہی ثانیٔ عالم ہے، اِس کائنات کو وُجود دینے والا وہی ہے لہٰذا اُس نے اِس کو بنایا ہے۔ پس وقت کا تعلق زیادہ سے زیادہ نفسِ کلی سے ہے۔ یہ آپ کے سوال کا جواب ہے۔ شکریہ۔

سوال:[(فتح علی حبیب) سر! آپ نے اِس لیکچر میں فرمایا کہ خدا جب قسم کھاتا ہے تو کسی اعلیٰ چیز کی قسم کھاتا ہے۔ پھر آپ نے مثال دی، کہ جب انسان جب قسم کھاتا ہے تو اُس سے اعلیٰ چیز کی جیسا کہ ماں کی، قرآن کی، خدا کی قسم کھاتا ہے تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا جو قسم کھاتا ہے عقلِ کل کی نفس کل کی تو وہ اُن سے اعلیٰ ہے۔ جبکہ آپ نے اپنے لیکچر میں بہت دفعہ یہ فرمایا ہے، کہ خدا کی صفات خدا کے لئے نہیں ہیں بلکہ امام اور پیغمبر کے لئے ہیں کیونکہ خدا خود اُس سے اعلیٰ ہے]۔

جواب: شکریہ، آپ نے سوال کیا اِس سے فائدہ ہوگا، تو میری گزارش ہے اِس سلسلے میں کہ انسان جب بھی قسم کھاتا ہے، تو اپنے سے اعلیٰ چیزوں کی قسم کھاتا ہے لیکن خدا سے اعلیٰ چیزیں نہیں ہیں بلکہ وہ ایسی چیزوں کی قسم کھاتا ہے جو اُس کے نزدیک ہیں، اُس کے تحت ہیں، اُس کے نیچے ہیں مگر اُس کے نزدیک ہیں اور بہت ہی بزرگی والی چیزیں ہیں شرافت والی چیزیں ہیں، تو ایسی باکرامت چیزوں کی وہ قسم کھاتا ہے۔ اِس لئے کہ خدا سے اُوپر کوئی شیٔ نہیں ہے، کہ اُس کی قسم کھائے اور خدا کے نیچے ہیں جتنی چیزیں ہیں۔ لہٰذا خدا اُن عزیز و مکرّم چیزوں کی قسم کھاتا ہے جو خدا سے قریب ہیں خدا کے نزدیک ہیں، اور دوسری مخلوقات سے بڑھ کر ہیں، تو خدا ایسی شریف چیزوں کی قسم کھاتا ہے۔ رہا سوال خدا کی صفات کے بارے میں کہ ہاں! خدا کی یہ شان ہے کہ وہ اپنی اعلیٰ مخلوق کی صفات کو اپناتا ہے، منسوب کرتا ہے اپنی ذات سے کیونکہ اُس کی صفات نہیں ہیں۔ جس طرح ہم کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ نہیں ہے لہٰذا پیغمبر خدا کا ہاتھ ہے، ہم کہتے ہیں کہ خدا کا چہرہ امامؑ ہے، اِس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کا اپنا کوئی چہرہ نہیں ہے کیونکہ وہ بے مثال ہے، بے نظیر ہے اور معراج کے قصّے میں بتاتے ہیں کہ مولا علیؑ کی زبان سے گفتگو ہوئی تو رسولِ اکرمؐ نے تعجّب سے پوچھا کہ یا خداوند! یہ علی ہیں یا آپ ہیں، تو خداوندِ عالم نے فرمایا کہ میں دُنیا کی چیزوں میں سے کسی چیز کے مشابہ نہیں ہوں، میں بے مثال اور بے نظیر ہوں۔ لہٰذا میں نے دیکھا آپ کے دل میں کہ آپ علیؑ سے دوستی رکھتے ہیں، تو میں نے آپ کے ایک محبوب فرد کی حیثیت میں آپ سے گفتگو کی، تو یہاں پر بھی اگر اللہ کا اپنا کوئی وُجود ہوتا تو معراج کے موقع پر اس کا پتا چلنا چاہیئے، معراج کے موقع پر تو دنیائے شیعیت کے مطابق علیؑ کی آواز میں گفتگو ہوئی اور بعض روایتوں کے مطابق سنّی روایتوں کے مطابق حضرت ابوبکر کی زبان سے گفتگو ہوئی، اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اِس روایت کو بھی مانتے ہیں، تو اِس میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے ایک اچھی منطق بنتی ہے، وہ یہ کہ وہ حضرات بھی قائل ہوئے کہ اللہ کا ایک مظہر ہوا کرتا ہے، تو وہ تو اِس مظہریت میں قائل ہو گئے اچھی بات ہے۔ لیکن سچ بات یہ ہے کہ مولا علیؑ کی زبان سے اور اُن کی آواز سے گفتگو ہوئی تھی۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کی اپنی صفات نہیں ہیں، اِس لئے حدودِ دین جو اعلیٰ حدود ہیں اور اُن کی جیسی صفات ہیں اُن کو خدا (adopt) کرتا ہے، جس طرح پیغمبر کے ہاتھ کو (adopt) کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: "یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ" (۱۰:۴۸) جس طرح امامؑ کے چہرے کو (adopt) کرتے ہوئے کہتا ہے کہ امام میرا چہرہ ہے، اِسی طرح یہ صفات کا جو سوال ہے یہ صحیح ہے کہ صفات خدا کی نہیں ہیں اور خدا سے

یہاں ایک درجہ مراد ہے اور وہ درجہ بھی کہاں الگ ہوسکتا ہے۔آپ کے سوال کا جواب مہیّا ہوگیا۔مہربانی۔

سوال:(سر!پانی کی تاویل علم ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دریا کے اندر خطرناک جانور ہوتے ہیں،تو اُن کی تاویل کو کس طرح لیں گے کہ علم کے اندر ایسی خطرناک چیز کس طرح ہوسکتی ہے؟اور دوزخ کے سات دروازے ہیں اُن میں سے مچھلیاں ایک دروازہ ہے،تو علم جو ایک مقدّس چیز ہے اُس کے اندر کس طرح دوزخ کا تصوّر ہے۔جس طرح دریا کے اندر خطرناک مچھلیاں ہیں جو دوزخ کا درروازہ ہیں؟اِس کی کچھ وضاحت فرمائیں)۔

جواب: بہت عمدہ سوال ہے اور اتنا اچھا سوال ہے کہ کسی نے خیال نہیں کیا تھا اور مشکل بھی ہے لیکن مولاکی یاری سے اور آپ کی دُعا سے،کہ علم پانی ہے یعنی علم پانی کا ممثول ہے اور پانی علم کی مثال ہے یا کہ کہنا چاہیئے کہ پانی کی تاویل علم ہے،اِن کا سوال ہے کہ اِس صورت میں پانی کے اندر اتنے حرام اور خطرناک اور ناپاک جانور کیسے ہوسکتے ہیں جیسے سانپ ہیں نہنگ [مگرمچھ] ہے وغیرہ وغیرہ۔یہ ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر جو دُنیا میں آئے اُنہوں نے خدائی علم کو دُنیا کی طرف کر کے ایک سمندر اور ایک طوفان برپا کر دیا،اور پھر اِس طوفان میں سمندر میں بہت سے نہنگ جانور حرام بھی، حلال بھی پیدا ہوگئے۔آج دُنیا میں جو علم ہے جو خاص علم ہے جو عام علم ہے وہ سب مل کر ہے۔جو خاص علم ہے وہ پاک پانی کی طرح ہے،جو عام علم ہے وہ کھارے پانی کی طرح ہے یا گندے پانی کی طرح ہے۔اِس علم کے سمندر میں مچھلیاں بھی رہتی ہیں جو حلال ہیں اور بڑے بڑے جانور جیسے وہیل مچھلی ہے یا دوسرے خطرناک جانور ہیں وہ بھی رہتے ہیں۔اُن بڑے بڑے جانوروں سے مراد یہ ہے،کہ آج علم کے بہانے سے دُنیا میں ایسے لوگوں کی کیا کمی ہے،جس طرح اپنے ماتحت لوگوں کو ہڑپ کر لیتے ہیں،جس طرح کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے اور اُن پر سلطنت وحکومت کرتے رہتے ہیں،یہ علم کے بہانے سے کرتے رہتے ہیں اور وہ ایک طرح کا علم ہے مگر اعلیٰ علم نہیں ہے۔ایسا علم ہے جو ناصاف پانی کی طرح ہے،تو اُس ناصاف پانی میں رہتے ہوئے وہ بڑے بڑے جانور دوسرے چھوٹے موٹے جانوروں کو ہڑپ کر لیتے ہیں اور اِس سلسلے میں آپ نے سوال اُٹھایا،کہ جہاں جہنم کے سات دروازوں کا ذکر ہے اُس میں سے دو دروازے تو پانی سے متعلق ہو جاتے ہیں یعنی جہنم کے دو دروازے وہ جانور ہیں جو پانی میں رہتے ہیں۔ایک وہ جانور ہیں جن کے پاؤں نہیں ہیں ایک وہ جانور ہیں پانی میں جن کے پاؤں ہیں،تو یہ دو قسم کے آبی جانور دوزخ کے دو دروازے ہیں،باقی پانچ دروازے خشکی پر ہیں،تو اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ بے شک دوزخ کے وہ دروازے بھی اِسی ظاہری علم کے اندر وجود رکھتے ہیں اور لوگ اُس میں سے دوزخ میں چلے جاتے ہیں۔سوال کا یہ حصّہ سوال کے اگلے حصّے سے مختلف نہیں ہے بلکہ دونوں کا مطلب ایک ہے کہ اِسی آلودہ علم کے اندر رہتے ہوئے جو لوگ دُوسروں کو گمراہ کر سکتے ہیں علم کے نام سے دعوت دے کر وہ گویا دوزخ کے دروازے ہیں،کہ لوگوں کو اُن دوزخ کے دروازوں کی طرف دعوت دی جاتی ہے اور لوگ

قبول کر کے اِس میں داخل ہو جاتے ہیں۔

علم پانی ہے اور پانی علم کی مثال ہے لیکن یہ دیکھنا ہے کہ پانی کی کیا کیفیت ہے؟ پانی صاف ہے یا ناصاف ہے، علم صاف بھی ہوسکتا ہے، ناصاف بھی ہوسکتا ہے۔ اگر علم روایت اندر روایت ہوتے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں ہاتھ چلا گیا ہے اور لوگوں نے اپنے اقوال سے، اپنی حکایات سے، اپنے تاثّرات سے، اپنے نظریات سے اور اپنی تحریروں سے اُس کو آلودہ کیا ہے، تو پھر وہ قابلِ قبول نہیں ہے۔ اُس علم سے ہماری پاکیزگی نہیں ہوسکتی ہے، جیسے گندے نالی کے پانی سے کوئی شخص کپڑا نہیں دھوسکتا ہے، نہ ہاتھ دھوسکتا ہے، نہ اُس کو (use) کرسکتا ہے کسی اور طرح سے لیکن بہت سے لوگ انجانے میں ایسے پانی کو یعنی ایسے علم کو استعمال کر رہے ہیں۔ مگر دُنیا میں ایک ہی مذہب ہے جس کو شناخت ملی ہے کہ اُس کو صاف پانی مل رہا ہے۔ خدا نے قرآن میں پانی کے بارے میں ذکر فرماتے ہوئے کہا کہ اُس نے آسمان سے پاک پانی کو نازل کیا ہے اِس کا مطلب یہ ہوا کہ نہر سے جو پانی آتا ہے اُس میں شبہ ہے۔ اِس تصوّر نے اور خدا کے اِس کلام نے سارے پانی کو مشکوک کر دیا جیسا اُس نے کہا کہ: ''وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا'' (۴۸:۲۵) اور ہم پانی کو اپنی اصلی اور پاکیزگی کی حالت میں آسمان سے برساتے ہیں، پھر خدا نے کوئی ضمانت نہیں لی کہ یہ پانی پاک ہے۔ شاید اُس کے لئے یہ ممکن تھا کہ ہمیشہ وہ پانی برساسکتا ہے اور لوگوں کے لئے یہ بارش کے پانی کو مہیّا کرسکتا ہے۔ جب یہ بات نہ ہوتی تو لوگوں کو مایوس نہیں کرنا چاہئے اُن کے دلوں میں شکوک پیدا نہیں کرنا چاہئے کہ خدا نے صرف بارش کے پانی کی تعریف کی، تالاب کے پانی کی، نہر کے پانی کی، دریا کے پانی کی، سمندر کے پانی کی، کسی پانی کی، اُس نے ضمانت نہیں لی گو کہ پانی پانی ہے، تو اِس کے لئے یہ ہمارے لئے مشکل ہے کہ پینے کے پانی کے پیچھے ہم اِس نہر سے چلیں جائیں دریائے سندھ اور پھر جائیں کوہِ ہمالیہ تک، جب کوہِ ہمالیہ جائیں گے تو شاید اور یقیناً وہاں پر صاف پانی ملے گا یا تو ہمیں اِس طرح سے چلنا چاہئے کہ جو پانی کا سرچشمہ ہے کہاں ہے وہاں جائیں۔ یہ بات ایسی ہوئی کہ ہم تواریخ میں پیچھے جائیں پیچھے جائیں اور مولا علیؑ کے زمانے میں پہنچ جائیں تو وہاں پر صاف پانی ملے گا یا یہ کہ بارش کے پانی کو لیں اس کا مطلب یہ ہے کہ بارش کے پانی سے مراد امامؑ کا فرمان ہے اور قرآن کا پانی پاک ہے، بصورت یہ کہ (interpretation) امامؑ کے ارشاد کے مطابق ہو تو کوئی شک نہیں ہے، اور قرآن کا پانی کوہِ ہمالیہ کے پہاڑوں کے چشموں کی طرح ہے یا اُس ندّی کی طرح ہے جو پہاڑ کے قریب سے بہتی ہے، تو ایسے میں پانی پاک ملے گا یہ آپ کے سوال کا مناسب جواب ہے، بہت اچھا سوال تھا۔ شکریہ۔

ٹائپنگ: شناوزیر علی نظرِ ثانی: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُرحکمت بیان
عنوان: سورۂ قیامت (کتاب: سوغاتِ دانش، صفحہ نمبر ۹۵)
کیسٹ نمبر: Q-17	تاریخ: ۵/اپریل/۱۹۸۴ء کراچی

Click here for Audio

سورۂ قیامت بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اِس میں رُوحانیت اور قیامت سے متعلق بہت سے بھید موجود ہیں۔ ویسے قرآن کا کون سا حصّہ ہے جس میں رُوح اور رُوحانیت کے بہت سارے اسرار موجود نہ ہوں تاہم ہمیں قیامت کے بارے میں جو کچھ جاننا چاہئے، اُس کا ایک خاص علم سورۂ قیامت میں موجود ہے اور اِسی وجہ سے اِس سورے کا نام سورۂ قیامت رکھا گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ میں روزِ قیامت یعنی رُوحانیت کی قسم کھاتا ہوں (۷۵:۱) یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یعنی یہاں خداوندِ عالم خود ہی قسم یاد فرماتا ہے اور جیسا کہ جانتے ہیں کہ خداوندِ عالم جہاں قسم کھاتا ہے وہاں کوئی بڑا راز موجود ہوتا ہے بلکہ بہت سے راز ہوتے ہیں۔ اور (بُرائی سے) اپنے اُو پر ملامت کرنے والے جی کی قسم کھاتا ہوں (۷۵:۲)۔ یہاں دو چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے، ایک تو روزِ قیامت ہے جس سے رُوحانیت مراد ہے اور دوسری چیز نفسِ لوّامہ ہے، نفسِ لوّامہ ایک ترقی یافتہ رُوح کا نام ہے۔ البتہ آپ جانتے ہیں کہ سب سے پہلے نفس، نفسِ امّارہ کہلاتا ہے، جب اُس کی کچھ ترقی ہوتی ہے تو نفسِ لوّامہ کہلاتا ہے اور جب وہ عروج پر پہنچ جاتا ہے تو نفسِ مطمئنّہ کہلاتا ہے، جس کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہے کہ: اے نفسِ مطمئنّہ! اپنے پروردگار کی طرف رُجوع ہوجا اور میرے بندوں میں داخل ہوجا اور میری جنّت میں داخل ہوجا، اپنے پروردگار سے راضی ہوتے ہوئے (۸۹:۲۷۔۳۰) تو یہ نفسِ لوّامہ خدا کی نظر میں اتنا پسندیدہ ہے، کہ خدا اُس کی قسم کھاتا ہے جس طرح رُوحانیت اور قیامت کی قسم کھاتا ہے اور اِس قسم کے کھانے کا مقصد کیا ہے؟ مقصد یہ بتانا ہے کہ اِنبعاث برحق ہے یعنی مقامِ اعلیٰ پر بیدار ہوجانا، عقلی طور پر جاگ اُٹھنا، علمی اور عرفانی طور پر زندہ ہوجانا، یہ برحق ہے اور اِسی مقصد کے لئے یہاں خدا نے دو چیزوں کی قسم کھائی ہے۔

اُس کے بعد ارشاد ہوتا ہے، کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اُس کی ہڈیوں کو بوسیدہ ہونے کے بعد جمع نہیں کریں گے (۷۵:۳)۔ ہڈیوں سے ذرّاتِ لطیف مراد ہیں جن کی یکجائی سے جسمِ مثالی بن جاتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ انسان جب مرجاتا ہے تو بوسیدہ ہوجاتا ہے۔ جسم کے بہت سے اجزاء ہیں، مثلاً خون ہے، گوشت ہے، رگیں ہیں، ہڈیاں وغیرہ لیکن

خداوندِ عالم اُن تمام اجزاء میں سے مثال کے لئے ہڈیوں کو لیتا ہے اور فرماتا ہے کہ کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اُس کی ہڈیوں کو بوسیدہ ہونے کے بعد جمع نہیں کریں گے۔ تو اِن ہڈیوں سے ذرّاتِ لطیف مراد ہیں کیونکہ ذرّاتِ لطیف ہڈیوں کے مشابہ ہیں اور جن کی یکجائی سے جسمِ مثالی بن جاتا ہے۔ کیونکہ قیامت کے متعلق مختلف تصوّرات پائے جاتے ہیں، کچھ کا کہنا ہے کہ انسان اِسی جسم میں زندہ ہو جائے گا، کچھ کا کہنا ہے کہ انسان رُوح میں زندہ ہو جائے گا اور بعض کا کہنا ہے کہ انسان جسم مِثالی میں زندہ ہو جائے گا۔ جسم مِثالی کو مثالی کا نام اِس لئے دیا گیا ہے کہ وہ اِس جسم کے مشابہ ہے مگر وہ اِس جسم سے بہتر اور برتر ہے کہ اُس میں کوئی رُطوبت نہیں، اُس میں سانس نہیں اور اُس میں کوئی آلائش نہیں۔ اُس کے بہت سے نام ہیں جیسے آسٹرل باڈی ہے، فلکی جسم ہے، جثۂ ابداعیہ ہے، جسمِ مثالی ہے، تو اُس جسم میں انسان زندہ ہو جائے گا کیونکہ آپ دیکھتے ہیں کہ موجودہ جسم بار بار ریختہ ہو جاتا ہے یعنی گر جاتا ہے، اِس کے ذرّات تحلیل ہوتے جاتے ہیں اور تقریباً چالیس دن کے اندر اندر یہ جسم یکسر بدل جاتا ہے۔ اِس تبدیلی کی مثال ہم ایک تالاب سے، ایک ایسے تالاب سے دے سکتے ہیں کہ اِس تالاب کا ایک تو منبع ہے اور ایک مخرج ہے یعنی ایک طرف سے اُس میں پانی گرتا جاتا ہے اور دوسری طرف سے پانی اُس سے نکلتا جاتا ہے، تو تالاب کے اندر جتنا پانی ہے یا پانی کا جو ذخیرہ ہے وہ اِس پانی کے گرنے سے اور نکلنے سے چالیس دن کے اندر یکسر بدل جاتا ہے، یعنی کُلی طور پر اُس میں سے پہلا پانی نکل چکا ہوتا ہے اور اُس کی جگہ پر نیا پانی بھرا ہوا ہوتا ہے۔ بالکل اِسی طرح انسان کی جسمانی ہستی باوُجود ایک طرف سے غذا کے کھانے سے اور دوسری طرف سے اِس کی فرسودگی سے، اِس کی تحلیل سے، اِس کے کام کاج کرنے سے اور حرکات وسکنات سے، سانس لینے سے، چلنے سے، پھرنے سے اِس کا بدن گھستا ہے یا فرسودہ ہوتا جاتا ہے اور اُس کی جگہ پر خوراک یعنی کھانے پینے سے اُس کی نئی ہستی بنتی جاتی ہے۔ اِس حساب سے سال میں تقریباً نو مرتبہ یہ انسان گرتا ہے اور بڑھتا ہے اور اس کی ایک مثال اس کے ناخنوں سے اور اِس کے بڑھتے ہوئے بالوں سے ظاہر ہے اور بعض دفعہ انسان جب بیمار ہو جاتا ہے تو تین یا چار دن کے اندر اندر یا ہفتے میں بالکل یہ گل جاتا ہے اور پھر ایک دو ہفتے میں اُس کی صحت بحال ہو جاتی ہے، تو اِن مثالوں سے اِس حقیقت کا پتا چلتا ہے کہ واقعاً انسان کی ہستی ایک ایسے تالاب کی طرح ہے جو ایک طرف سے بھرتا جاتا ہے اور دوسری طرف سے خالی ہوتا جاتا ہے۔

اب اِس صورت میں قیامت کا تعلق اور وابستگی یا حساب کتاب یا جزا وسزا اِس جسم سے ہو، تو پھر اِس میں سے کس جسم کو لیا جائے گا، حالانکہ اِس جسم کی اہمیت آپ دیکھتے ہیں۔ تو محاسبہ نفس کے ساتھ ہونا چاہئے اور نفس بغیر کسی جسم کے ٹھہر نہیں سکتا ہے اُس کے لئے لطیف جسم کا ہونا صحیح ہے، تو جو لوگ قیامت کا تصوّر بدن کے ساتھ رکھتے ہیں جو حشر بل جسد پر یقین رکھتے ہیں تو اُس میں کئی گروہ ہیں اور اُن میں سے ایک گروہ یہ ہے کہ اِس قسم کے جسم کے ساتھ انسان کا حشر ہوگا۔ برعکس

اِس کے دوسرے لوگ اِسی جسم کو مانتے ہیں کہتے ہیں کہ خداوندِ عالم انسان کی اُس گلی سڑی ہستی کو قبر میں سے ازسرِ نو زندہ کرے۔لیکن ہمارے یہاں قبر سے مراد خود انسان کی شخصیت ہے،کہ اگر قیامت کے لئے کچھ دیر ہے، کچھ وقت باقی ہے تو انسان کی رُوح یعنی اُس شخص کی رُوح جو مَر گیا ہے تو کسی اور شخص سے وابستہ ہو جاتی ہے،تو اِس لئے جسمِ مثالی کا تصوّر ہے اور یہ لفظ بھی قرآن سے ہے یعنی قرآن کی کئی آیات میں جسمِ مثالی کا تذکرہ ملتا ہے۔

ہاں! ہم اِس پر قادر ہیں کہ اِس کی پور پور دُرست کریں (۷۵:۴)۔خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے،ہاں! ہم اِس پر قادر ہیں کہ اِس کی پور پور درست کریں۔آگے تشریح کے طور پر کہا گیا ہے کہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں اٹھائیس پور ہیں جو اٹھائیس حجتّوں کو ظاہر کرتیں ہیں۔جن میں سے دونوں انگوٹھوں کی چار پور، چار مقرّب حجتوں کی مثال ہیں اور باقی انگلیوں کی چوبیس پوریں، دن اور رات کے باقی چوبیس حجتّوں کی دلیل ہیں، جن کا تعلق بارہ جزائر سے ہے، کیونکہ انسان کی رُوحانی حیات و بقا اور انفرادی قیامت کا لگاؤ ذرّاتِ لطیف، حجّتانِ روز و شب اور امامِ عالیؑ مقام سے ہے۔جیسے یہاں خداوندِ عالم نے ارشاد فرمایا کہ ہم اِس پر قادر ہیں کہ ہم اِس کی پور پور درست کریں،تو خداوندِ عالم کا کوئی کلام سطحی معنوں پر مبنی نہیں ہوتا ہے، بلکہ اُس کے اندر عظیم حکمتیں پوشیدہ ہوا کرتی ہیں۔چنانچہ خداوندِ عالم کا یہ ارشاد اور یہ ذکر کہ وہ مرے ہوئے انسان کی پور پور کو زندہ کرے گا،تو ہم نے دیکھا کہ انسان کے دونوں ہاتھوں میں اٹھائیس پوریں ہیں اور پور جیسا کہ آپ جانتے ہیں انگلی کے دو گانٹھوں کے درمیان کا حصّہ ہے تو دونوں ہاتھوں میں اٹھائیس پوریں ہیں۔اٹھائیس میں سے دونوں انگوٹھوں میں چار ہیں،تو یہ بالکل حجّتانِ روز و شب کا ذکر ہے کہ وہ اٹھائیس ہیں، چودہ ایک طرف ہیں اور چودہ دوسری طرف، چودہ شب کے لئے مقرّر ہیں اور چودہ روز کے لئے مقرّر ہیں،تو اُن اٹھائیس میں سے پھر چار الگ ہیں کہ وہ حجّتانِ مقرّب کہلاتے ہیں، باقی چوبیس میں سے بارہ بارہ جزائر سے وابستہ ہیں اور یہ حدودِ دین کا اور دعوتِ باطن کا نظام ہے، اب یہ حدود کسی بھی مردے کی پور کس طرح قرار پاسکتے ہیں؟ اِس لئے کہ کوئی بھی مومن جب رُوحانی طور پر زندہ ہوتا ہے پہلے، تو وہ مردہ کہلاتا ہے،تو اُس پر جب رُوحانیت کا دروازہ کھل جاتا ہے،تو تین مراتب سے اُس کا گزرنا ہوتا ہے،ایک یہ کہ ذرّاتِ لطیف، ایک یہ کہ امام کے حدود جو اٹھائیس ہیں، ایک یہ کہ آخر میں امامؑ سے اِس کی وابستگی ہو جاتی ہے۔یعنی پہلے وہ ذرّات سے گزرتا ہے اُس کے بعد اٹھائیس حجتّوں میں وہ زندہ ہو جاتا ہے اُس کے بعد امام میں زندہ ہو جاتا ہے اور جہاں یہ امام میں زندہ ہو جاتا ہے،تو یہ اِس کا انبعاث ہے۔آپ جب کتابِ وجہ دین کو پڑھیں گے اُس کا مطالعہ کریں گے تو یہ ساری باتیں آپ کو وہاں نظر آئیں گی۔

بلکہ انسان تو یہ چاہتا ہے کہ اپنے آگے بھی ہمیشہ بُرائی کرتا چلے جائے (۷۵:۵)۔پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہوگا (۷۵:۶) تو جب آنکھیں چکا چوند میں آجائیں گی (۷۵:۷) یعنی جب رُوحانیت کی تیز روشنی سے آنکھیں خیرہ ہو جائیں

گی۔ یہاں پر ایک بات قابلِ ذکر ہے یہ کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جیسے ہی کوئی شخص مرجائے گا تو اُس کی قیامت برپا ہوجائے گی۔لیکن قیامت دوطرح سے برپا ہوجاتی ہے، ایک شعوری طور پر اور دوسری غیر شعوری طور پر۔ جس کو دُنیا میں شاخت سے یا معرفت سے واسطہ نہیں پڑا ہے، تو اُس پر شعوری قیامت کس طرح برپا ہوسکتی ہے۔ کیونکہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ جو دُنیا میں اندھا رہے گا جو دُنیا میں خود کو اندھا بنالے گا تو وہ قیامت میں بھی اندھا ہی رہے گا (۱۷: ۷۲)۔ اُس کو وہاں کوئی آنکھ نہیں ملے گی، اِس کے برعکس جو دُنیا میں چشمِ باطن، کو چشمِ معرفت کو حاصل کرے گا، تو وہ قیامت میں بھی بینا ہوگا دیکھنے والا ہوگا۔ اِسی کے مطابق قیامت دوقسم کی قرار پائی شعوری قیامت اور غیر شعوری قیامت۔ شعوری قیامت کا مطلب یہ ہے کہ جو اِس باہوش قیامت میں ہوں گے وہ سب کچھ دیکھیں گے اور پہچانیں گے اور جو لوگ غیر شعوری قیامت میں ہوں گے تو اُن کو کچھ پتا نہیں چلے گا قیامت تو اپنی جگہ ہوتی جائے گی۔

اب یہاں آپ دیکھتے ہیں علامت کیا ہے، تو خدا اُس کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایک طرف سے بندے کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ فرماتا ہے کہ بندہ کہتا ہے کہ قیامت کب ہوگی، خدا اُس کی علامت یہ بتاتا ہے کہ قیامت اُس وقت ہوگی جب کہ آنکھیں چکا چوند ہوجائیں، آنکھیں خیرہ ہوجائیں، یہ اشارہ ہے، کہ قیامت ایک رُوحانی ترقّی کا نام ہے، قیامت جہاں شعوری قیامت ہے تو وہ ایک ترقّی کا نام ہے، اُس میں جب آنکھیں روشنی سے، نور سے چکا چوند نہ ہوجائیں تو وہ کیسے قیامت ہوسکتی ہے تو قیامت کو رُوحانیت سے وابستہ کیا گیا۔ پھر اسی کے بعد ارشاد ہوا کہ: اور چاند میں گرہن لگ جائے گا (۷۵: ۸) یعنی قیامت اُس وقت ہوگی کہ چاند میں گرہن لگ جائے۔ اِس کے کیا معنی؟ یعنی رُوحانی مسافر کی حیثیت جو ماہِ کامل کی طرح چمکنے لگی تھی وہ ایک بار مدھم ہوجائے گی، جس طرح یہ ذکر ہو چکا ہے کہ پہلے رُوحانی پیدائش ہے پھر نفسانی موت آتی ہے اور آخر میں انبعاث ہے۔ حضرت عیسیٰ ؑ اور حضرت یحیٰؑ کی زبان سے قرآن میں ارشاد فرمایا گیا ہے اور آپ کو قریۂ ہستی کے مقالے میں یہ ذکر آیا ہے، کہ ایک تو رُوحانی پیدائش ہے، جسمانی پیدائش نہیں اِس کا ذکر الگ ہے رُوحانی پیدائش، اُس کے بعد نفسانی موت ہے یعنی جہاں عزرائیل کا مرحلہ آتا ہے۔ اُس کے بعد اُسی رُوحانیت کے اندر نفسانی موت سے جی اُٹھنا ہے زندہ ہوجانا ہے انبعاث ہے۔ اُسی واقعے کو یہاں چاند گرہن سے تشبیہہ دی گئی ہے یعنی مرحلۂ عزرائیل سے متعلق جو کچھ واقعہ گزرتا ہے اُسی کی دوسری مثال چاند گرہن ہے۔ چاند اسماعیلی تاویلات میں حجّت ہے لیکن تاویل میں گوناگونی ہوتی رہتی ہے اور بنیاد اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے۔ یہاں اِس کی تاویل یہ ہے کہ بندۂ مومن جسے یہاں رُوحانی مسافر کہا گیا ہے یا سالک کہا گیا ہے، رُوحانی مسافر کسی منزل کی تلاش میں جو آگے سے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے تو یہ اصطلاح اپنے طور کی اصطلاح ہے اور صوفیوں کی اصطلاح میں سالک، سالک کا مطلب کیا؟ سالک جو مسلک پر چلتا ہے، چلنے والا، سلوک چلنا، سالک چلنے والا، مسلک راستہ تو رُوحانی مسافر اور سالک دونوں کا مطلب ایک ہے۔ جب

سالک یا کہ رُوحانی مسافر حدودِ دین کی سیڑھیوں سے یا زینوں سے عروج کرتا چلا جاتا ہے اور مقام حجّت کو پہنچتا ہے تو اُس وقت اُس کی رُوحانی حیثیت میں گرھن لگتا ہے یعنی کہ منزلِ عزرائیل سے دو چار ہو جاتا ہے اور منزلِ عزرائیل سے دو چار ہونے کے بعد پھر اب کیا رہتا ہے، انبعاث رہتا ہے یعنی مرنے کے بعد جی اُٹھنا رہتا ہے۔ اِسی مرنے کے بعد جی اُٹھنے کو یہاں کہا گیا ہے کہ پھر قیامت اُس وقت ہوگی جب چاند کو گرھن لگے اور جب سورج اور چاند کو ایک کر دیا جائے گا۔ دیکھا آپ نے، پہلے چاند کو گرھن لگ جاتا ہے اور پھر اُس کے بعد سورج اور چاند ایک ہو جاتے ہیں یعنی وہ سالک یا کہ وہ رُوحانی مسافر امام سے واصل ہو جاتا ہے، تو ایک اعتبار سے یہ چاند حجّت ہے چونکہ یہ سالک حجّت کے زینے پر ہے اور دوسرے اعتبار سے یہ چاند سالک ہے یا رُوحانی مسافر ہے تو دونوں باتیں صحیح ہیں لیکن اِس کی تاویل صرف یہی نہیں ہے اور بھی ہے مثال کے طور پر ہم اِس کی تاویل اِس طرح سے بھی کر سکتے ہیں کہ قیامت کے دَور میں سورج اور چاند ایک ہو جائیں گے جیسے ہمارا زمانہ ہے کہ اِس میں امام اور حجّت ایک ہو چکے ہیں یعنی بظاہر حجّت نہیں ہے اِس لئے نہیں ہے کہ وہ تو امامؑ کے ساتھ ایک ہو گئے ہیں۔

اور سورج اور چاند اکٹھا کر دیئے جائیں گے (۷۵:۹) یعنی اُس وقت رُوحانی مسافر یا کہ سالک کی انا حدودِ دین کی سیڑھی پر جو حجّتِ اعظم تک پہنچ گئی تھی وہ امامِ اقدس واطہر سے واصل ہو جائے گی یعنی سالک کی انا واصل ہو جائے گی، جسم نہیں شخصیت نہیں اور یہی اُس کا انبعاث ہے یعنی مر کر جی اٹھنا یہی ہے۔ انسان کہے گا آج کہاں بھاگ کر جاؤں (۷۵:۱۰) یعنی انبعاث کا تعلق رُوح اور انا سے ہے مگر جسم جب تک زندہ ہے اُس پر شدید قسم کی تکلیف کا آنا لازمی ہے، جس کی مثال انبیاء علیھم السّلام کی حیاتِ طیّبہ سے مل سکتی ہے۔ دیکھا آپ نے کہ مومن کی انا امام سے واصل ہو جاتی ہے انا کو تو سکون مل جاتا ہے۔ اب باقی رہی شخصیت یا جسم تو جسم کو جب تک یہ دنیا میں ہے تکلیف سے چھٹکارا نہیں ہے بلکہ اور زیادہ تکلیف اِس میں بڑھ جاتی ہے۔ کیا انبیاءؑ اپنے اپنے وقت میں اصل سے واصل نہیں ہوئے تھے، اُن کا انبعاث نہیں ہوا تھا، اُن کا انبعاث ہو چکا تھا اور اگر انبعاث ہونے کے ساتھ تکالیف ختم ہو جاتی ہیں تو پھر کیوں اُن پیغمبروں پر جسمانی اور ظاہری تکالیف آتی رہیں۔ انا الگ ہے جسم الگ ہے، جسم اِس دنیا میں رہتا ہے اور رُوحِ علوی کی رسائی اُس جہان تک ہے، تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رُوح کو معرفت حاصل ہو گئی اور جسم کو اِسی کے ساتھ دنیا میں آسائش ہو۔ ہاں! اِس تصوّر میں آسائش صحیح ہے کہ کوئی شخص رُوح کی نجات کو سمجھے اور اُس سے خرسند رہے اور جسمانی مصیبتوں پر صبر کرے اور اِس خیال وتصوّر سے اُس کو سکون مل سکتا ہے، نہیں تو واقعاً اِس کو جسمانی طور پر کس طرح سکون مل سکتا ہے جبکہ وہ اِس دنیا میں رہتا ہے بلکہ اُس کی تکالیف میں اضافہ ہو جاتا ہے چونکہ وہ بڑی ذمّہ داریوں کے لئے آگے بڑھتا ہے اور بڑی بڑی آزمائشوں کے لئے خود کو تیار کرتا ہے۔ انسان کہے گا یعنی آج کہاں بھاگ کر جاؤں (۷۵:۱۰) یعنی انبعاث کا تعلق رُوح اور انا سے ہے مگر جسم

جب تک زندہ ہے اُس پر شدید قسم کے تکالیف کا آنا لازمی ہے، جس کی مثال انبیاءؑ کی حیاتِ طیّبہ سے مل سکتی ہے ۔

یقین جانو کہیں پناہ نہیں اُس روز تمہارے پروردگار ہی کے پاس ٹھکانا ہے (۷۵: ۱۱۔ ۱۲) یعنی جسمانی مصائب و آلام سے زندگی میں ہنگامی نجات اور مرنے کے بعد دائمی نجات خدا تعالیٰ ہی کے حضور میں ملتی ہے۔ نجات دو قسم کی ہے، زندگی میں ہنگامی ہے، وقتی ہے اور مرنے کے بعد دائمی ہے۔ جب دُنیا میں ہم کوشش کرتے ہیں عبادت و بندگی سے اور اچھی باتوں سے اور خدا کے تصوّر سے تو دل کو تسکین ملتی ہے یہ ہنگامی نجات ہے یا کسی اور طرح سے ہم ہنگامی نجات حاصل کر سکتے ہیں دائمی نجات نہیں۔ دائمی نجات اُس وقت ہے جسم کے لئے جب ہم اِس دُنیا کو چھوڑیں گے تو دائمی نجات جسم کے اعتبار سے مل جائے گی، تو یہ دونوں قسم کی نجات خدا کے حضور میں ملتی ہیں ۔

اُس دن آدمی کو جو کچھ اُس نے آگے پیچھے کیا ہے بتادیا جائے گا بلکہ انسان خود اپنی حالت پر خوب مطلع ہوگا (۷۵: ۱۳۔ ۱۴) یعنی شعوری قیامت میں نامۂ اعمال جو بولتی کتاب ہے اُس سے سب کچھ ظاہر ہوگا۔ اِس معنیٰ میں انسان چشمِ باطن سے اپنے جملہ احوال کو دیکھ سکتا ہے۔ دوسرے حضرات کا یہ تصوّر ہے کہ نامۂ اعمال کو دیکھ پانے کے لئے موت درکار ہے لیکن اسماعیلی تصور اِس سے مختلف ہے۔ یہ کہ جیسا کہ امامؑ کا ارشاد ہے کہ بہشت کے لئے اسماعیلی مذہب میں موت کا انتظار نہیں ہے [’’یہاں رہتے ہوئے مومن کے کام کرو تو اِس دنیا میں رہتے ہوئے بھی تم اصل میں واصل ہو سکتے ہو، ہمارے مذہب میں دُنیا میں رہ کر اصل میں واصل ہونا بہت آسان ہے‘‘ کلامِ امامِ مبین، حصّہ دوّم، دارالسّلام، ۹/ ۳/ ۱۹۲۵ء] یعنی جیتے [جی] بھی بہشت ہے اور یہاں بہشت سے رُوحانیت مراد ہے۔ جب بہشت سے رُوحانیت مراد ہے تو نامۂ اعمال جیتے جی مل سکتا ہے اور جس کو نامۂ اعمال جیتے جی مل جائے تو اُس میں سب کچھ ہے۔ ہم نامۂ اعمال کے متعلق قرآن سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ نامۂ اعمال کیا ہے۔ اگرچہ وہ عذر معذرت کرتا رہے (۷۵: ۱۵) یہاں عذر معذرت سے یہ مراد ہے کہ انسان رُوحانی ترقّی کی بابت بہت سے بہانے کر سکتا ہے۔ اِس کے لئے خدا نے کہا کہ اگرچہ وہ بہت کچھ عذر معذرت کرے ۔

اے رسول وحی کے جلدی یاد کرنے کے واسطے اپنی زبان کو حرکت نہ دو (۷۵: ۱۶) اِس میں حضورِ اکرمؐ کے اسمِ اعظم اور ذکرِ قلبی سے متعلق ہدایت بھی ہے۔ تحقیق اِس کا تمہارے قلب میں جمع کر دینا اور پڑھنا ہمارے ذمّہ ہے (۷۵: ۱۷) یعنی سر کی زبان سے نہیں بلکہ سِرّ کی زبان سے پیغمبرِ خدا نے اسمِ اعظم کا ذکر کیا اور یہ دراصل فرشتے کی زبان ہے۔ یہاں بہت ہی ضروری بات کہی گئی ہے، سر کی زبان اور سِرّ کی زبان، سر کی زبان جو منھ میں ہے، سِرّ کی زبان جو قلب میں ہے۔ جب انسان خصوصی عبادت میں سر کی زبان استعمال کرتا ہے تو سِرّ کی زبان کے لئے کوئی موقع نہیں ملتا ہے، اُس کو حرکت نہیں ملتی ہے، (motion) نہیں ملتی ہے، اِس لئے کہا گیا کہ سر کی زبان کو حرکت نہ دو، کوشش یہ کرو کہ سِرّ کی زبان سے تم بول سکو ذکر کر سکو، سر کی زبان کو بند کرنے کے لئے فرمایا گیا اور امامؑ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ اِسی قرآن

میں سے ہے، تو جب بندۂ مومن زبان کو حرکت سے روک لیتا ہے خصوصی ذکر میں اور روکتے ہوئے ذکر کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سِرّ کی زبان رفتہ رفتہ حرکت میں آتی ہے۔ اب یہاں اِس سلسلے میں جو عمدہ بات ہے وہ یہ کہ سِرّ کی زبان کیا ہے؟ سِرّ کی زبان فرشتے کی زبان ہے، جو فرشتے کی زبان ہے وہ خدا کی زبان ہے۔ چونکہ خدا خود کلام نہیں فرماتا ہے وہ اکثر فرشتوں کی زبانی کلام فرماتا ہے یعنی رُوح القدّس کی زبان خدا کی زبان ہے اور بندۂ مومن کے سِرّ کی زبان فرشتے کی زبان ہے۔ مطلب اِس کا یہ ہوا کہ اگر مومن سر کی زبان کو حرکت نہ دے اور سِرّ کی زبان سے بولنے کی کوشش کرے تو جب بھی سِرّ کی زبان کھل جائے گی تو وہ فرشتے کی زبان کھل جائے گی اور اُس میں خدا بولنے لگے گا۔ اِس میں یہ راز ہے جس میں آنحضرتؐ پر قرآن نازل ہوا اور آنحضرتؐ پر قرآن جو نازل ہوا تھا، تو جبرائیل کی زبان سے نازل ہوا تھا اور جبرائیل آنحضرتؐ کی ایک پوشیدہ صلاحیت تھی، وہ سِرّ کی زبان تھی۔ جو خدا کی زبان تھی اور اُسی میں وحی تھی۔

جب ہم اُس کو جبرائیل کی زبانی پڑھیں تو تم بھی اِسی طرح پڑھا کرو پھر اِس کی تاویل کا سمجھا دینا بھی ہمارے ذمّہ ہے (۱۸:۷۵۔ ۱۹) یہاں پر "ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ" (۱۹:۷۵) اِس کی یہ وضاحت کی گئی ہے، تو قرآن کے بیان کی ذمہ داری آنحضرتؐ پر نہیں رکھی گئی ہے، اِس کی ذمّہ داری خداوندِ عالم نے خود ہی لے لی ہے، اِس معنی میں کہ یہ قرآن کا بیان جس سے تاویل مراد ہے زمانۂ نبوّت میں ختم ہونے والی نہیں تھی، وہ تو آگے چل کر خدا کی طرف سے ہونے والا تھا یعنی اماموں کے ذریعے سے قرآن کا بیان ہونا تھا۔ آپ اِس آیت میں اِسی سورۂ قیامت میں اچھی طرح سے غور کریں، تو آپ کو بالکل یہ مطلب واضح ہو جائے گا کہ: "ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ" کا کیا مطلب ہے؟ بیان یہاں تاویلات نہیں ہے، بیان یہاں قرأت نہیں ہے، بیان یہاں تنزیل نہیں ہے۔ بیان وضاحت ہے، بیان صراحت ہے اور بیان یہاں تاویل ہے۔ پس قرآن میں اِس لفظ کی روٹ سے بنے ہوئے جتنے بھی الفاظ ہوں گے اُن تمام میں یہی عناصر پائے جائیں گے، مثلاً مبین یہ بیان سے ہے، کتابِ مبین، بولنے والی کتاب، تاویل بتانے والی کتاب، امامِ مبین کے ایک معنی ظاہر امامؑ اور دوسرے معنی امامِ مبین کے تاویل بیان کرنے والا امام۔ کیونکہ قرآن کے لئے اصل جو ڈکشنری ہے وہ قرآن ہی ہے۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ قرآن کے اندر جو ربط ہے لغوی ربط معنی ربط اُس کو دیکھنا چاہئے کہ ایک جیسے الفاظ جو ایک ہی روٹ سے بنے ہوئے ہیں، کہاں کہاں ہیں، یہ اُصول ہے کہ ایک لفظ کی وضاحت دوسرے لفظ سے ہوتی ہے۔ "ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ" کا مطلب اِس طرح سے ہے یعنی ہر زمانے میں معلمِ قرآن ہوا کرے گا جو خدا اور رسول کی جانب سے مؤوّل ہوگا، مؤوّل کا معنی تاویل بیان کرنے والا۔ لوگوں جیسا تم سمجھتے ہو ایسا نہیں بلکہ تم دُنیا کو دوست رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑے بیٹھے ہو (۲۰:۷۵۔ ۲۱) یعنی اُصولِ رُوحانیت کو نظر انداز کر رہے ہو۔ اُس روز بہت سے چہرے تو ترو تازہ بشاش ہوں گے اور اپنے پروردگار کو دیکھ رہے ہوں گے (۲۲:۷۵۔ ۲۳) یہ دیکھیں ترجمہ ہے اور اپنے پروردگار کو دیکھ

رہے ہوں گے یعنی اُن لوگوں کی سب سے بڑی خوشی اِس بات سے ہوگی کہ وہ اپنے ربّ عزّت کو ایک طرح سے دیکھ سکیں گے اور پہچان لیں گے۔

اسماعیلی مذہب میں دیدارِ خداوندی سے متعلق جو تصوّر ہے وہ دو باتوں پر مبنی ہے، خدا کا دیدار ایک طرح سے ہوگا اور پھر دوسری طرح سے نہیں ہوگا۔ کبھی آپ نے خیال رکھا ہوگا کہ جو اُونچی حقیقتیں ہوتی ہیں اُن کو نفی اور اثبات دونوں مل کر بیان کر سکتی ہیں، ایک نہیں یا یوں کہا جائے کہ جو اُونچی حقیقتیں ہوتی ہیں اُس کے کم سے کم دو دو پہلو ہوا کرتے ہیں، اِس لئے خدا کا دیدار ہوگا اور نہیں ہوگا یعنی ایک اعتبار سے دیدار ہوگا اور دوسرے اعتبار سے نہیں ہوگا۔ جس اعتبار سے خدا کا دیدار ہوگا وہ یہ ہوگا کہ امام جو مظہرِ خدا ہیں اُن کی صورت میں خدا کا دیدار ہوگا، جس طرح دُنیا میں خدا کی معرفت امامؑ کے وسیلے سے ہوتی ہے تو بات ظاہر ہے کہ کل کو خدا کا دیدار وسیلے سے ہوگا وہ یہ کہ امام کی صورت میں ہوگا اور ایک طرح سے دیکھا جائے جو ہمارے داعیوں نے، بزرگوں نے تصوّر دیا تو خداوندِ عالم ہر بات سے بالا و برتر ہے۔ دونوں باتیں صحیح ہیں لیکن جو مظہریت کا تصوّر ہے وہ اپنی جگہ پر ایک بہت ہی مستحکم حقیقت ہے اور آج کے زمانے میں جو نظامِ دعوت ہے یا جو وعظ و نصیحت کے لئے جو امامؑ نے ہمیں کلیّہ دیا ہے یا فارمولا عطا فرمایا ہے وہ یہ کہ ہم امام کو مظہرِ خدا مان سکتے ہیں۔ ابھی ابھی قریب میں فرمان کی ایک کاپی بعض ذمّہ دار لوگوں کو ملی ہے، اُس کے مطابق۔ لہٰذا یہ مظہریت قیامت میں بھی ہے اور دُنیا میں بھی ہے، لہٰذا دیدارِ خداوندی بلکہ جملہ اوصافِ خداوندی کا مظہر امام زمانؑ ہے۔ پس جہاں قرآن میں خدا کا ذکر ہے وہ امام کا ذکر ہے، اِس لئے کہ امام خدا کا مظہر ہے اور امام کے توسّط سے امام کے وسیلے سے، تو جن کو قیامت کے دن امام کا دیدار ہوگا وہ گویا ربّ کا دیدار ہوگا تو وہ بہت ہی خوش ہوں گے۔ اُس روز بہت سے چہرے تر و تازہ بشاش ہوں گے اور اپنے پروردگار کو دیکھ رہے ہوں گے (۷۵: ۲۲۔ ۲۳) یعنی اُن لوگوں کی سب سے بڑی خوشی اِس بات سے ہوگی کہ وہ اپنے ربّ العزّت کو ایک طرح سے دیکھ سکیں گے اور پہچان لیں گے، اور بہتیرے منہ اُس دن اداس ہوں گے، سمجھ رہے ہیں کہ اُن پر وہ مصیبت پڑنے والی ہے کہ کمر توڑ دے گی (۷۵: ۲۴۔ ۲۵) اِس میں علمی و عرفانی مفلسی کی طرف اشارہ ہے۔ لوگو! جیسا تم سمجھتے ہو ایسا نہیں، جب جان بدن سے کھینچ کے ہنسلی تک آپہنچے گی اور کہا جائے گا کہ اِس وقت کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا ہے اور مرنے والے نے گمان کیا کہ اب سب سے جدائی ہے (۷۵: ۲۶۔ ۲۷) اِس میں نفسانی اور جسمانی دونوں قسم کی موت کا ذکر ہے، اور شدّتِ سکراتِ موت سے ایک پنڈلی دوسری پنڈلی سے لپٹ جاتی ہے اُس دن تجھ کو اپنے پروردگار کی بارگاہ میں چلنا ہے (۷۵: ۲۹۔ ۳۰) موت تو دونوں صورت میں سخت ہے خواہ رُوحانی ترقّی کے سلسلے میں مرحلۂ عزرائیلی سے متعلق ہے خواہ جسمانی موت ہے، تو ہر حالت میں یہ بہت شدید ہے۔

تو اُس نے نہ (کلامِ خدا کی) تصدیق کی نہ نماز پڑھی (۷۵: ۳۱) تصدیق، صدقِ اکبر یعنی اساس یعنی علیؑ کے

وسیلے سے ہوتی ہے۔حدیث سے آپ کو پتا چلے گا کہ رسولِ اکرمؐ نے مولا علیؑ کو صدیق اکبر کا ٹائٹل دیا اور پیر ناصرِ خسرو قس اِس کی وضاحت فرماتے ہیں کہ صدیق کے معنی تاویل کرنے کے ہیں اور صدیق اکبر جو اساس ہیں وہ اوّلین تاویل کرنے والے ہیں [وجہ دین،ص: ۲۶۴] تو یہاں تصدیق سے قرآن کی حکمت اور تاویل سے مراد ہے کہ اُسی سے تصدیق ہوتی ہے کیونکہ سارے بھید اور سارے رموز اور ساری حکمتیں اُسی میں ہیں۔ پھر اِس صورت میں خدا اور رسول کی اور قرآن کی تصدیق ہوتی ہے۔مگر جھٹلایا اور ایمان سے منہ موڑا پھر اپنے گھر کی طرف اِتراتا ہوا چلا، تیری کمبختی پر کمبختی آنے والی ہے پھر (مکرّر سن لے کہ) تیری کمبختی پر کمبختی آنے والی ہے کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ وہ یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا (۷۵:۳۲۔۳۵) یعنی اگر کوئی شخص آتش جہالت میں ہلاک ہو جائے تو پھر بھی اُسے قانونِ رحمت زندہ کر دے گا۔کیا وہ ابتداً منی کا قطرہ نہ تھا جو رحم میں ڈالی جاتی ہے پھر لوتھڑا ہوا پھر خدا نے اُسے بنایا پھر اُسے درست کیا (۷۵:۳۷۔۳۸)۔اِس میں نہ صرف جسمانی تخلیق کا ذکر فرمایا گیا ہے بلکہ رُوحانی تکمیل کا بھی تذکرہ ہے۔پھر اِس میں سے دو جوڑے بنائے (۷۵:۳۹) یعنی ایک مرد اور ایک عورت یعنی ایک ہی نور سے عقلِ کل اور نفسِ کل کا وجود بنایا نیز ایک ہی نور سے ناطق اور اساس موجود ہوئے۔کیا وہ اِس پر قادر نہیں کہ رُوحانیت اور قیامت میں ہر قسم کے مردوں کو زندہ کرے (۷۵:۴۰) یعنی یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام عقلی، رُوحانی اور جسمانی مردوں کو زندہ کرے گا کیونکہ وہ قادرِ مطلق ہے یعنی کوئی عقلی طور پر مرتا ہے کوئی رُوحانی طور پر مرتا ہے اور کوئی جسمانی طور پر مرتا ہے لیکن بُری موت وہ ہے کہ کوئی عقلی طور پر یا رُوحانی طور پر مرے جسمانی طور پر تو سب کو مرنا ہے لیکن خداوندِ عالم ان سب کو زندہ کرے گا اور اگر کوئی شخص جہنم میں چلا گیا ہے تو اُس کو بھی اصلاح کے بعد سزا کے بعد زندہ کرے گا۔

کیونکہ خدا نے فرمایا کہ کسی کو فضول نہیں بنایا گیا ہے ایک مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔سزا اپنی جگہ پر درست ہے کہ دنیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ کوئی بھی سنجیدہ اور ترقّی پسند، اصلاح پسند حکومت ہوتی ہے تو اُس کا جیل ہوتا ہے، قید خانہ ہوتا ہے اور لوگوں کو جیل میں ڈالنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا ہے کہ لوگوں سے دشمنی رکھی جائے اور اُن سے انتقام لیا جائے بلکہ اِس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُن کی اصلاح ہو جائے اور اصلاح کے بعد ایک اچھی سوسائٹی کو چاہتی ہے حکومت، ایک اچھے معاشرے کو وجود میں لانا چاہتی ہے۔اِس کے لئے ایک اصلاحی مقصد کے پیشِ نظر قید خانہ ہوا کرتا ہے اور اِس سے بڑھ کر خدا نے جو دوزخ بنایا ہے وہ لوگوں کی اصلاح کے لئے ہے، اُن کو سنوارنے کے لئے ہے، اُن کو سدھارنے کے لئے ہے، انتقام لینے کے لئے نہیں ہے اور انتقام میں برابری کا تصوّر ہوتا ہے لیکن خدا جو اتنی اعلیٰ صفات کا مالک ہے اور اُس نے ساری مخلوقات بنائی ہے تو اُن کو مختلف وسائل سے آگے بڑھانا چاہتا ہے، تو ہر قسم کے مردوں کو خداوندِ عالم زندہ کرے گا اور بہشت میں سب لوگ جمع ہو جائیں گے۔گو کہ بہشت میں مدارج یعنی درجات ہوں گے، کچھ تو اعلیٰ مراتب پر فائز ہوں گے،

کچھ رعایا کی طرح ہوں گے لیکن سب بہشت میں ہوں گے اور رعایا کی طرح وہ ہوں گے جنہوں نے دُنیا میں نہیں سمجھا، نہیں سنا یا انکار کیا یا کافر ہوئے یا منافق ہوئے، اِس قسم کے لوگ وہاں بہشت میں حور وغلمان کی حیثیت سے یعنی دوسرے درجے کے حور وغلمان کی حیثیت سے ہوں گے اور مومنین کی سلطنتِ رُوحانی میں وہ رعیّت کا کام انجام دیں گے اور بہر حال وہ سب بہشت میں یکجا ہو جائیں گے اور امام کا بھی یہی ارشاد ہے۔

آخر میں توضیح، قرآن حکیم میں اکثر و بیشتر ایک ایسی قیامت کا ذکر ملتا ہے جو ایک طرف سے انفرادی ہے اور دوسری طرف سے اجتماعی۔ یعنی ایک ہی قیامت کے دو پہلو ہیں ایک طرف سے اِس میں انفرادی حیثیت رکھتی ہے اور دوسری طرف سے اجتماعی۔ کیونکہ وہ شعوری طور پر صرف ایک ہی فرد کی قیامت ہوا کرتی ہے مگر غیر شعوری طور پر سب کی، جس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کا وقوع عالم ذرّ میں ہوتا ہے، جہاں تمام مردوں اور زندوں کا بصورتِ ذرّات انتہائی عظیم اجتماع ہوتا ہے۔ قیامت عالم ذرّ میں واقع ہوتی ہے، ذرّات کی دُنیا میں۔ ایک شخص تو اپنے آپ میں ہوتا ہے اور شعوری طور پر اِن چیزوں کو دیکھتا ہے، باقی سب خواہ مردے ہیں یا زندے سب ذرّات کی شکل میں وہاں حاضر ہوتے ہیں، تو یہ کون شخص ہوتا ہے؟ سب سے پہلے پیغمبر ہوا کرتا ہے، اُس کے بعد وصی اساس پھر امام، اُس کے بعد اُس کے حدود میں سے چند بھی ہو سکتے ہیں، یہ لوگ قیامت کو جیتے جی دیکھتے ہیں اور باقی سب لاشعوری طور پر اُس مقام پر حاضر ہوتے ہیں مگر ذرّات میں ہوتے ہیں۔ مطلب اِس کا یہ ہوا کہ قیامت ایک سلسلہ ہے، انفرادی ہے لیکن اُس میں ذرّات کے اعتبار سے اجتماعی ہے اور ایک امام اور دوسرے امام کے درمیان اگر حدود کی بات نہ کریں تو پھر وقفہ ہوتا ہے اور لوگوں کو انتظار چاہئے کہ قیامت کو دیکھیں اور اُن کا حساب کتاب ہو۔ اگر امام کے حدود کا زمانہ ہے تو حدود میں پھر یہ قیامت ہوتی ہے۔ اِسی طرح انفرادی قیامت میں اجتماعی قیامت پوشیدہ ہوا کرتی ہے۔ اب اِس کا ثبوت قرآن سے کہ قیامت اکثر انفرادی ہوتی ہے اُس کا ثبوت کہاں ہے؟ قیامت کا وقوع عالمِ ذرّ میں ہوتا ہے جہاں تمام مردوں اور زندوں کا بصورتِ ذرّات انتہائی عظیم اجتماع ہوتا ہے لیکن لوگ اِس سے بے خبر رہتے ہیں، جیسا کہ فرمایا گیا۔ اب یہ آیت کا ترجمہ ہے: اور تم ہمارے پاس تنہا تنہا آ گئے (۶: ۹۴) یعنی ایک کی قیامت ہوئی پھر درمیان میں وقفہ ہوا پھر دوسرے کی قیامت ہوئی پھر تیسرے کی قیامت ہوئی، اِس طرح ایک قیامت کا سلسلہ چلتا رہا اور تم ہمارے پاس تنہا تنہا آ گئے۔ خطاب تو سب سے ہے لیکن تم تنہا تنہا آ گئے، اگر یہ سب ایک ساتھ جاتے تو یہ بات نہیں ہوتی، فرمایا جاتا کہ تم سب مل کر ہمارے پاس آ گئے، تم تنہا تنہا آ گئے، یہ خطاب ایک سلسلے سے ہے یعنی تم یکے بعد دیگرے آ گئے ایک ساتھ نہیں آئے۔ پھر جس طرح ہم نے اوّل بار تم کو پیدا کیا تھا (۶: ۹۴) یعنی انسان کی سب سے اُونچی حقیقت کیا ہے، مبدِع ہے، مبدَع ہے، عقلِ کلی ہے وہ تو ایک ہی ہوتا ہے تو آپ اُس کو ایک ہی فرد مانیے، تو خدا نے پیدائش کے دوران ایک ہستی کو پیدا کیا، ایسا نہیں کہ سب کو ایک ساتھ پیدا کیا ٹھیک۔

اِس کے علاوہ اِس آیۂ حکمت آگین میں اجتماعی قیامت کے پہلو کو چھوڑ کر انفرادی قیامت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ابھی ہم نے کہا تھا کہ قیامت کے دو پہلو ہیں، ایک انفرادی ہے اور دوسرا پہلو اجتماعی ہے، اِس آیت میں اجتماعی پہلو کو نظر انداز کیا ہے کیونکہ وہ لاشعوری طور پر ہے وہ شعوری قیامت نہیں ہے۔ لہٰذا خدا نے اِس آیت میں صاف طور سے فرمایا کہ قیامت انفرادی ہے گوکہ اُس میں ایک اجتماعی پہلو ہے مگر وہ غیر شعوری طور پر ہے، اِس لئے اِس آیت کے اندر اُس کا ذکر نہیں فرمایا صرف شعوری قیامت کا ذکر فرمایا اور فرمایا کہ تم اکیلے اکیلے، تنہا تنہا، فرداً فرداً ہمارے پاس آگئے ٹھیک! جیسے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔ پہلی بار کس طرح انسان پیدا ہوا تھا تو اُس کی تھوڑی سی مثال میں نے عقلِ کُل سے، مبدِع سے، مبدَع سے دی۔ اِس کے علاوہ ظاہری طور پر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ انسان دنیا بھر کے انسان یا کسی خاندان کے انسان یا کسی شہر کے انسان ایک ساتھ پیدا نہیں ہوتے ہیں، وہ الگ الگ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ثبوت ہے کہ جس طرح آنا الگ الگ ہے اِس طرح جانا الگ الگ ہے یہ بہت بڑا ثبوت ہے۔ اب اِس کے علاوہ آخر میں یہ ثبوت پیش کیا گیا ہے کہ اور ثبوت پیش کیا گیا ہے کہ جس طرح لوگ دنیا میں فرداً فرداً آتے ہیں اسی طرح یکے بعد دیگرے درجۂ کمال پر خدا تعالیٰ کی طرف رُجوع ہوجاتے ہیں۔ جس کی ایک روشن مثال حضرات انبیاء وائمہؑ کے مختلف زمانوں میں فرداً فرداً اور الگ الگ آنے جانے سے ظاہر ہے۔ اِس سے بڑھ کر کوئی ثبوت نہیں ہے، ہم دیکھتے ہیں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اور حضراتِ ائمہ جتنے بھی ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے، دُنیا میں آئے ہیں وہ سب ایک ساتھ نہیں آئے، وہ مختلف زمانوں میں آئے۔ اُن کو درجۂ کمال مختلف زمانوں میں الگ الگ ملا اور اُنہوں نے مختلف زمانوں میں فرداً فرداً دُنیا کو چھوڑا اور اِسی میں اُن کی انفرادی قیامت پوشیدہ تھی جو آیت میں مذکور ہے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ قیامت جو انفرادی ہے، الگ الگ، جدا جدا زمانوں میں واقع ہوتی رہتی ہے۔ جیسے آیت میں ہے کہ: ''وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ'' (۶: ۹۴) تم ہمارے پاس تنہا تنہا آگئے جس طرح ہم نے تم کو بارِ اوّل پیدا کیا تھا۔ اشارہ کہ بارِ اوّل ہم نے تم کو فرداً فرداً پیدا کیا تھا، تو اِسی کے ساتھ یہ تحریر یا سورے کی یہ تفسیر وتاویل ختم ہوجاتی ہے۔ میرے نزدیک یہ بہت اہم بات ہے کہ سورۂ قیامت کو آپ دیکھیں اور اِس تحریر سے فائدہ اُٹھائیں اور اِس کے علاوہ بھی جو مقالے ہیں اُن سے بھی مدد لیں۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ اِس میں بہت ہی مفید باتیں ہیں اور اِن شاء اللہ آپ اِسی طرح بہت ترقی کریں گے۔ شکریہ آپ نے بہت توجّہ سے سنا۔ یا علی مدد۔

سوال: [(امین رحمانی) سر! آپ نے بہت ہی عمدہ طریقے سے وضاحت فرمائی کہ قیامت شعوری طور پر ایک فردِ واحد پر ایک وقت میں ہوتی ہے اور باقی تمام لاشعوری طور پر اُس جائے قیامت پر جمع ہوجاتے ہیں۔ تو اِس معلوم ہوگیا کہ بہت کم لوگ پوری دنیا کی آبادی میں سے جب سے دُنیا ہے اُس وقت سے جب تک دنیا رہے گی کچھ مٹھی بھر لوگ ہی

ہیں جن کو یہ شعوری قیامت حاصل ہوئی، جن میں انبیاءؑ اور ائمہؑ اور حدودِ دین شامل ہیں۔ باقی پر جو لاشعوری قیامت گزرے گی تو کیا اُن کے لئے کوئی ایسا موقع ہوگا کہ اُن پر بھی کبھی شعوری قیامت گزرے اور اگر ایسا ہوگا، تو اِس میں اُن کو بار بار آنا ہوگا نا کامی کی صورت میں یا کامیابی کی صورت میں، اُس وقت تک جب تک کہ اُن پر شعوری قیامت نہ گزر جائے؟)]

جواب: عمدہ سوال ہے یہ میرے ذہن میں تھا اور میں نے اِس کے بارے میں سوچا ہے اور غور بھی کیا ہے، تو "وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ" (۱۴۰:۳) یہ اِس سوال کے لئے کلیّہ بھی ہے اور جواب بھی ہے۔ اسماعیلی مذہب میں بڑی وسیع القلبی سے سوچا جاتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے لئے ایک عبادت ہے کہ اُس کی مخلوق کے لئے ہم اچھے خیالات رکھیں۔ خدا کی خدائی بے پایان ہے، نہ اُس کا کوئی آغاز ہے نہ انجام، تو اتنا بے پایان وقت اِس لئے ہے کہ خدا کی جو مخلوق ہے وہ اِس بے پایان وقت کے پیشِ نظر مٹھی بھر سے زیادہ نہیں ہیں۔ لہٰذا بے پایان وقت کے ہونے کے سبب سے بہت سے لوگوں کو اِس کا موقع ملے گا۔ کیونکہ جب کوئی مومن بہت بلندی پر دیکھتا ہے تو انسانیت کو ایک متحدہ حقیقت پاتا ہے اور آج اگرچہ ظاہر میں انسانوں کے آپس میں مخالفت ہے، دشمنی ہے تو نورِ معرفت کی روشنی میں دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ اِس مخالفت میں بھی حکمت، اِس دشمنی کا بھی کوئی نتیجہ ہے۔ اسماعیلی مذہب آفاقی مذہب ہے، اِس کے آفاقی ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اِس کے نظام میں دُنیا کی اقوام کو بارہ حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر قسم میں ایک حجّتِ شب اور ایک حجّتِ روز کو متعیّن کیا ہے۔ بھلا شب سے کیا مراد اور روز سے کیا مراد؟ شب شر ہے اور روز خیر ہے، شب باطن ہے اور روز ظاہر ہے، تو آپ نے بہت گہرائی سے سوال کیا ہے اب میں راز کو بتائے بغیر میں کیا کروں گا۔ آپ نے بہت بُری طرح سے گرفت کی ہے تو مجھے مجبوراً اُس بھید کو ظاہر کرنا پڑے گا جو بہت ہی بڑا بھید ہے۔

یہ چار مقرّب حجّت ہیں ایک جبرائیلؑ کی جگہ پر ہے، ایک میکائیلؑ ہے، ایک اسرافیلؑ ہے، ایک عزرائیلؑ ہے، تو اِن دو میں سے بھی دو خیر کی طرف سے ہیں دو شر کی طرف سے ہیں، دو مومنین ہیں تو دو کافرین ہیں۔ مطلب میرا یہ ہے کہ دنیا میں جو تضاد ہے اُس میں بھی حکمت ہے۔ کسی بھی کامیاب مومن کو دو طاقتیں بناتی ہیں ایک خیر کی طاقت ہے اور اُس کے مقابلے میں دوسری شر کی طاقت ہے۔ دونوں طاقتیں اِس کو بناتی ہیں اور اگر شر کی طاقت یعنی دشمنی فضول ہوتی تو خدا اُس کو نہیں بناتا۔ اِس قسم کی روشنی میں دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ سب مخلوق اللہ کی ہیں۔ یہ وقتی بات ہے کہ جو کافر اور مومن کا مسئلہ ہے اور وقت گزرنے کے بعد پھر سب آپس میں مل جاتے ہیں۔

اِس لئے آپ کے سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ خداوندِ عالم سب کو موقع عنایت فرمائے گا، یہ اسماعیلی مذہب کی خوبی ہے اور انتہائی وسیع القلبی ہے اور اسماعیلی مذہب اِسی معنیٰ میں آفاقی مذہب ہے۔ دوسرے حضرات اپنے مسلک کو آفاقی بناتے ہیں لیکن وہ اتنے تنگ دل ہیں کہ کہتے ہیں کہ لوگ جہنم میں ابدالآباد مبتلا رہیں گے۔ ابھی ابھی میں نے آپ کو عرض کیا

تھا کہ خدا ہر قسم کے مردے کو زندہ کرے گا، خواہ عقلی مردہ ہو، رُوحانی ہو، جسمانی ہو، تو یہ اُس کی رحمت ہے۔ میرا یہی تصور تھا اِس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ خداوندِ عالم ہر قسم کے مردے کو زندہ کرے گا اور اگر عقلی طور پر بھی وہ سب کو زندہ کرتا ہے تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ سب کو مختلف زمانوں میں موقع دینا چاہتا ہے اور اِس آیت میں: ''وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی'' دیکھیں اِس کا ایک طرح سے سب پر اطلاق ہوتا ہے یعنی ماضی میں یہ واقعہ ہو چکا ہے کہ سب ایک بار خدا کے حضور میں جا چکے ہیں۔ ''وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی'' اور خدا کے لئے ماضی اور مستقبل نہیں ہے اُس کے لئے حال ہی حال ہیں اور خدا جو ہزاروں برس بعد میں پیش آنے والا واقعہ ہے اُس کو بھی حال کے طور پر بیان کرسکتا ہے۔ بہرحال یہ آپ کا سوال بڑا اچھا تھا لیکن بہت ہی بھیدوں تک رسائی کرنے والا سوال تھا۔ شکریہ آپ کے سوال کے لئے۔

ٹائپنگ: ثناوزیر علی نظرِ ثانی: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُر حکمت بیان

عنوان: سورۂ طٰہٰ (۲۰:۱۔۶) کی حکمتیں

کیسٹ نمبر: Q-18   تاریخ: ۵/ جنوری/ ۱۹۸۲ء کراچی

Click here for Audio

عزیزوں کے سامنے سورۂ طٰہٰ کی کچھ ابتدائی آیات میں سے بعض حکمتوں کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

"بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ طٰہٰ ○ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤی ○ اِلَّا تَذۡكِرَةً لِّمَنۡ یَّخۡشٰی ○ تَنۡزِیۡلًا مِّمَّنۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ وَالسَّمٰوٰتِ الۡعُلٰی ○ اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی ○ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ وَمَا بَیۡنَهُمَا وَمَا تَحۡتَ الثَّرٰی" (۲۰:۱۔۶)۔

سب سے پہلے اِس سورۂ مبارک کے اندر خدائے جلیل وجبّار کا ارشادِ مبارک ہے اور فرمایا گیا ہے کہ: اے پاک! اے طاہر! یعنی اے رسول ﷺ خداوندِ عالم آنحضرتؐ سے مخاطب ہے فرماتا ہے کہ: اے پاک! طٰہٰ کے معنی یہاں پاک کے ہیں، اور یہ بات تاویلات میں سے ہے، اور اشارات میں شامل ہے اور بہت سے علماء اِس کو تسلیم کرتے ہیں کہ طٰہٰ آنحضرتؐ کا ٹائٹل ہے، اور اِس کے معنی ہیں پاک، تو کوئی شک نہیں کہ رسولؐ پاک تھے، اس لئے کہ قرآن کے کئی مقامات پر یہ ذکر ملتا ہے، کہ رسولؐ مومنین کو آیات سنا کر اور حکمت سکھا کر پاک کیا کرتے تھے (۳:۱۶۴) یہ ایک روشن دلیل ہے کہ دُنیا کے اندر کوئی ناصاف پانی کسی کی پاکیزگی کے لئے کام نہیں آسکتا ہے، لیکن پانی جہاں پاک ہے تو وہ پاک پانی کسی کو پاک کر سکتا ہے، برتن کو، کپڑے کو، نہانے میں، طہارت لینے میں اور کھانے کے لئے، پینے کے لئے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ کچھ لوگ اِس نظریئے کی نکتہ چینی کرتے ہیں، جس میں کہ رسول کو پاک اور مقدّس مانا جاتا ہے۔ اُن کے لئے جو نکتہ چینی کرتے ہیں اور رسولِ اکرمؐ کو ایک عام بشر سمجھتے ہیں اُن کے لئے بڑے افسوس کا مقام ہے، وہ اِس میں نہیں سوچتے ہیں کہ خدا نے آنحضرتؐ کو طٰہٰ کہا، اِس کے علاوہ رسولؐ کے ناموں کو لیا جائے۔ آپ معتبر کتب سے رسولِ اکرمؐ کے اسمائے گرامی کا مطالعہ کر سکتے ہیں اُس میں بڑا فائدہ ہے۔ جس طرح خدا کے بہت سارے نام ہیں اِسی طرح رسولؐ کے بھی بہت سے نام ہیں، ایک دانشوری حیثیت سے آپ کو ایسے نام یعنی رسولؐ کے اسماء اپنے مطالعے میں رکھنا چاہیے، اِس سے علمی طور پر کئی فائدے ہوں گے اور اِسی تصوّر کے متعلق بہت سی شہادتیں آپ کو ملیں گی کہ رسولؐ کس طرح پاک ہیں۔ ناموں سے پتا چلے گا کہ اُن ناموں میں پاکیزگی کے معنی ہیں یا نہیں ہیں اور وہ نام ایسے ہیں کہ بہت سے فرقوں کے نزدیک مسلّمہ ہیں۔

دُوسرا فائدہ اِس میں یہ ہوگا کہ آپ کو کچھ ایسے نام بھی ملیں گے جو خدا، رسول اور امام میں مشترک ہیں۔ اِس سے پھر سوچنے کا ایک نیا باب کھل جائے گا، مثال کے طور پر ''نور'' یہ ایک ایسا اسم ہے جو خدا اور رسول اور امام کے درمیان مشترک ہے اور اِس اشتراک سے یہ موقع ملتا ہے، کہ ہم سوچیں کہ حقیقتِ حال کیا ہے اور شاید سوچتے سوچتے ہم اِس نتیجے پر پہنچ جائیں، کہ اصل میں یہ ایک حقیقت ہے جس کے بہت سے نام ہیں۔ کیونکہ اگر ہم خدا کو الگ نور تسلیم کریں، رسول کو ایک جداگانہ نور مانیں اور امام کو ایک اور نور تسلیم کریں، تو اِس سے کوئی بھی نور کامل نہیں رہ سکے گا۔ نتیجے کے طور پر کوئی شخص یوں سوچنے لگے گا کہ خدا بذاتِ خود نور تھا لیکن کچھ گوشے اُس کی روشنی سے رہتے تھے، کہ وہاں تک خدا کے نور کی روشنی نہیں پہنچ سکتی تھی، لہٰذا اُس نے اُن گوشوں پر اُجالا کرنے کے لئے رسول بھیجے اور پھر اِس سے بھی خدا کا مقصد پورا نہیں ہوتا تھا کیونکہ دین کے کچھ گوشے یا کہ زمان ومکان کی کچھ جگہیں رسول کی روشنی سے بھی محروم رہ جاتی تھیں، لہٰذا ایک تیسرا نور مقرّر ہوا۔ اب اِس منطق سے تینوں انوار میں سے کوئی نور مکمل اور ہمہ رس نہیں رہا، حالانکہ ہم نے آیاتِ نور میں سے جس آیت کو مرکزی حیثیت میں مان لیا ہے، اُس کا کہنا ہے کہ اللہ بذاتِ خود ایک ایسا کامل اور مکمل نور ہے، کہ اُس کی رسائی سے کوئی شیٔ نہ زمین میں نہ آسمان پر باقی اور باہر نہیں رہ سکتی ہے: ''اَللّٰهُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ'' (۳۵:۲۴) مختصر اور جامع الفاظ میں اللہ نے فرما دیا اور اِس میں کوئی سوال باقی نہیں رہا، کہ بلند درجات کے لئے کون نور ہے؟ اللہ، پست درجات کے لئے کون نور ہے؟ اللہ، زمین کے لئے کون نور ہے؟ اللہ، آسمان کے لئے کون نور ہے؟ اللہ، فرشتوں کے درمیان کون نور ہے؟ اللہ، رُوحوں کے درمیان کون نور ہے؟ اللہ، عالمِ انسانیت کے لئے کون نور ہے؟ اللہ، عالمِ دین کے لئے کون نور ہے؟ اللہ، ظاہر کے لئے کون نور ہے؟ اللہ، باطن کے لئے کون نور ہے؟ اللہ۔

اِس آیت کی تشریح یہ ہے اور اگر مزید تشریح کی ضرورت ہے تو آپ سورۂ حدید میں جایئے وہاں پر ارشاد ہے کہ: ''هُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالۡبَاطِنُ'' (۵۷:۳) جس چیز کو موجود کہا جاتا ہے وہ اِن چار احوال کے گھیرے میں ہے یا ازل میں ہے یعنی اوّل میں ہے یا آخر میں ہے یا ظاہر میں ہے یا باطن میں ہے، اِس کے علاوہ کوئی مقام نہیں ہے جسے مکان کہا جاتا ہے، جسے زمان کہا جاتا ہے، جسے لامکان کہا جاتا ہے وہ سب اِن چار احوال کے تحت ہیں، تو خدا نے اِس آیت کے اندر فرمایا کہ ہر جگہ پر وہی ہے۔ خدا کی ذات اگر باطن میں محدود ہوتی تو ظاہر کے لئے کسی اور کو ہونا چاہئے، خدا اگر اوّل میں، ازل میں ہوتا اور ابد تک پہنچنے کا امکان نہ ہوتا تو کسی اور کو وہاں ہونا چاہئے جس ذات نے سورۂ نور میں خود کو کائنات کے ظاہر و باطن کا نور قرار دیا تھا اُسی ذات نے یہاں یہ فرمادیا کہ وہ اوّل میں بھی ہے، آخر میں بھی ہے، ظاہر میں بھی ہے اور باطن میں بھی ہے ہر حال میں وہی موجود ہے اور رہوگا۔ اب پھر پیغمبر کی کیا ضرورت ہے؟ امام کی کیا ضرورت ہے؟ اگر آپ خدا کو کامل اور مکمل مانتے ہیں اور کامل نور تسلیم کرتے ہیں، تو آپ پیغمبر اور امام کے تصوّر سے دستبردار

ہو جایئے۔ نہیں تو آپ اِن تین درجات کو ایک حقیقت اور ایک نور مانیے، اِس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے یا یہ ہے کہ پیغمبر اور امام سے انکار کیجئے کیونکہ خدا بذاتِ خود کافی وافی ہے اور اُس نے اعلان فرمایا کہ آیۂ نور کے اندر کہ: ''اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ'' (۳۵:۲۴) وہاں دُوئی کی کوئی گنجائش نہیں رہی، کسی دوسرے کو نور کہلانے کا کوئی حق ہی نہ رہا نمائندگی کا سوال ختم ہوگیا، خلافت کا سوال بھی ختم ہوگا، اِس آیت نے اِس شان سے اعلان کیا، تو اِس کے لئے کیا کیا جائے، وہی بات یا یہ کہ آپ پیغمبر اور امام سے منکر ہو جایئے اور صرف اللہ کی ذات کو مانیے یا یہ ہے کہ آپ اِن تین ناموں کو درجات مانیے اور حقیقت کو ایک ہی تسلیم کر لیجئے اور قرآن کے اندر جتنی مختلف تعلیمات آپ کے سامنے آتی ہیں، اُن کے متعلق آپ یہ تصوّر قائم کیجئے کہ یہ تو ذیلی تعلیمات ہیں۔ کیونکہ قرآن نے صراطِ مستقیم کا تصوّر دیا اور سیڑھیوں کا تصوّر دیا ہے اور خداوندِ عالم نے یہ اشارہ بھی فرمایا کہ اُس کے حضور تک رُوح اور فرشتے پچاس ہزار برس میں پہنچتے ہیں (۷۰:۴) اور اُسی جگہ پر سیڑھی کا تصوّر دیا، اِس کے معنی یہ ہوئے کہ خدا کی طرف رُخ کئے ہوئے فرشتے اور رُوحیں پچاس ہزار زینوں پر کھڑے ہیں، اِس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر صحیح طور سے تحلیل کیا جائے تو رُوح اور دین کی تعلیمات میں گویا کہ پچاس ہزار کلاسیں مقرّر ہیں۔

آپ ہم سے پوچھیں اِس کا کیا ثبوت ہے اور یہ کہ وہ کیا چیز ہے جو خدا کی طرف لے جاتی ہے؟ وہ ہدایت ہے اور وہ علم ہے۔ مثلاً ایک فرشتہ یا کوئی رُوح ایک (step) پر کھڑی ہے، کیوں کھڑی ہے؟ ہدایت کی منتظر ہے ایک علم کو چاہتی ہے، جب اُس کو وہ علم ملے گا جس سے کہ یہ اِس (step) کو چھوڑ کے اُوپر کے (step) کو جانا چاہتا ہے، تو تب یہ اُوپر کے (step) کو جا سکے گا اور اُوپر والا جو ہے وہ بھی منتظر ہے ایک ایسی ہدایت کے لئے کہ اُس کی بدولت وہ اُوپر کو جا سکتا ہے۔ دانشمند کو یہ بات ظاہر ہے کہ اگر سب لوگ (stairs) پر ہیں، سیڑھیوں پر ہیں، زینوں پر ہیں، تو وہ زینے علم و ہدایت کے سوا اور کسی چیز کے نہیں ہیں، وہ مادّی قسم کے زینے نہیں ہیں اور وہ سیڑھی بھی کوئی جسمانی شئ نہیں ہے، یہ علم کی مثال ہے اور علم کی درجات کی مثال ہے۔ لہٰذا اِس سے ثبوت ملا کہ جہاں خدا فرماتا ہے، کہ اُس نے ایک نور بھیجا ہے، نور بھیجا ہے یہ بات صحیح ہے لیکن آخری بات نہیں ہے، کس طرح اُس نے نور بھیجا ہے اِس کو جاننے کی ضرورت ہے اور اُس کی ایک مادّی مثال ہم کو ملتی ہے، سورج اگر کہے کہ اُس نے زمین کی سطح کو جگمگانے کے لئے روشنی بھیجی ہے تو یہ بات غلط نہیں ہے۔ کیونکہ دھوپ جو زمین پر پڑتی ہے وہ سورج کی روشنی ہے، وہ سورج کی کرنیں ہیں اور سورج جو کچھ بھی اِس سلسلے میں کہتا ہے وہ صحیح کہتا ہے، لیکن اِس کے معنی یہ نہیں کہ اِس بھیجنے سے ہم دُوئی کا تصوّر کریں، (duality) کو سمجھیں، تو سورج کی کرنوں میں اور سورج کے سر چشمے میں دُوئی کہاں ہے، جدائی کہاں ہے، وہاں تو وصل ہی وصل ہے اور وصال ہی وصال ہے۔

تو ہماری بات سورۂ طٰہٰ میں تھی اور وہاں پہ خداوندِ عالم نے آنحضرتؐ کو طٰہٰ فرمایا تھا، پاک قرار دیا تھا، تو وہاں سے ہم ذرا چل نکلے تو ہمارے سامنے ایک وسیع میدان آیا اور اُس میں ہم چلے تو چلنے میں مزہ آیا تو بہت دُور جا نکلے۔ اب

آیئے لوٹیں اور واپس ہو جائیں کہ رسولؐ پاک ہیں اور جس کے بارے میں دوسری مثال مادّی طور پر ہم نے یہ بتائی تھی کہ دنیا کے اندر جب تک پانی پاک نہیں ہے، ندّی، چشمہ، دریا اور اگر وہ پانی ایک چھوٹے سے برتن میں محدود ہے اور وہ ناصاف ہو چکا ہے، گندا ہو چکا ہے تو آپ کو جائز نہیں ہے، کہ اُس میں ہاتھ دھوئیں، منہ دھوئیں اور جامہ شوئی کریں یعنی کپڑے کو دھوئیں اور کھانے میں استعمال کریں۔ لیکن جہاں آپ کو صاف و شفاف چشمہ ملتا ہے وہ آپ کو پاک اور پاکیزہ کرسکتا ہے، رسولؐ کی یہ شان ہے۔ ایک بات یہاں یاد رکھنے کے قابل ہے، جب ہم رسولؐ کی تعریف کرتے ہیں تو سمجھ لینا کہ ہم امامؑ کی تعریف کرتے ہیں، رسول کو چھوڑیں اور امامؑ کی تعریف کریں یہ دانشمندی کی بات نہیں ہے، اِس میں گویا ہم رسولؐ کو امامؑ سے غیر سمجھتے ہیں، کتنی نادانی کی بات ہوگی۔ ابھی ابھی ہم نے کہا کہ یہ تو درجات ہیں بلکہ جہاں آپ خدا کی تعریف کریں گے، تو اُس میں بھی یوں سمجھ لینا کہ یہ تو حقیقت ہے، اُس میں رسول کی بھی تعریف ہے اور امام کی بھی تعریف ہے، جب آپ امام کی تعریف کریں گے یہ سب کچھ کرنے کے بعد تو اُس میں رسول کی تعریف ہے خدا کی تعریف ہے۔

لیکن یاد رکھیے امام کی شان میں کچھ آیات ثابت کرنا چاہتے ہیں تو رسولؐ سے شروع کیجئے، اِس کے بغیر کوئی مثال آپ نہیں دے سکتے ہیں۔ انسانِ کامل کے بارے میں آپ کیا کہہ سکیں گے جب تلک کہ آپ رسولؐ کی تعریف نہیں کرتے ہیں، رسولؐ ہی تو ہیں جو انسانِ کامل ہیں اور امام ایک طرح سے ظاہری شریعت میں رسولؐ کے جانشین ہیں تو آپ رسولؐ سے شروع کریں اور وہاں سے ثبوت فراہم کریں پھر امام میں آئیں۔ ابھی میں کہہ رہا تھا کہ ان ناموں سے جو خدا اور رسول اور امام میں مشترک ہیں تو اُن ناموں میں سے ایک نام نور ہے، جس کی ہم نے تشریح کی تو اُس میں سے ہم کو (unity) ملی، اُسی سے ہم کو ثبوت ملا۔ اب دوسری مثال لیتے ہیں، ایسے ناموں میں سے ایک نام ’’الشَّہِید‘‘ ہے، تو قرآن میں خدا نے خود کو ’’الشَّہِید‘‘ کہا ہے (۹۸:۳)، گواہی کے معنی میں، شاہد اور شہید گواہ کو کہا جاتا ہے۔ پھر دوسرے مقام پر رسول کو ’’الشَّہِید‘‘ کہا ہے (۳۳:۴۵)، اور ایک اور مقام پر اماموں کو شہید یعنی گواہ کہا گیا ہے۔ اِس مبارک نام کی گہرائی میں جائیں تو تب بھی آپ کو بہت ساری حکمتیں ملیں گی لیکن ہم فی الوقت اُس کی تشریح میں جانا نہیں چاہتے ہیں، صرف یہ مقصود تھا کہ خدا اور رسول اور امام میں مشترک بہت سے نام ہیں، اُن کی گہرائی میں جانے سے (unity) مل جاتی ہے یہ یاد رکھنا اب ہم مزید آگے بڑھنے کے لئے کوشش کرتے ہیں۔

خداوندِ عالم کا اِس سورہ میں ارشاد ہے کہ: اے رسول! ہم نے آپ پر قرآن اِس لئے نازل نہیں کیا ہے کہ آپ مشقّت اُٹھائیں، ’’اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى‘‘ (۲۰:۳) لیکن اِس میں نصیحت ہے اُس شخص کے لئے جو خدا کا خوف رکھتا ہے یعنی قرآن کا نزول ایک ایسی ذمّہ داری کی حیثیت میں نہیں ہے کہ رسولؐ لوگوں کے پیچھے پھرے اور اگر کچھ لوگ ایمان نہیں لاتے ہیں تو اِس کے لئے آپ غم کھائیں اور بہت اُس میں محنت کریں اور ہر کافر کو، ہر منافق کو دین کے رستے

پر لانا اپنے او پر فرض سمجھیں۔ اگر یوں ہوتا تو قرآن آنحضرتؐ پر باعثِ مشقّت ہوتا۔ خدا نے صاف ارشاد میں فرمادیا کہ قرآن آپ کے لئے باعثِ مشقّت نہیں ہے، باعثِ رحمت ہے، اُس میں نصیحت ہے صرف اور صرف اُن لوگوں کے لئے جو خدا سے ڈرتے ہیں اور جو خدا سے نہیں ڈرتے ہیں اُن کے لئے کچھ نصیحت نہیں ہے، تو یہاں بھی وہ تقویٰ کی بات ہوگئی کہ جن کے دل میں خوفِ خدا نہیں ہے اُن کے لئے کوئی علاج نہیں ہے اور اگر علاج ہوتا تو رسولؐ سے فرمایا جاتا کہ دیکھیں رسول ضرور اور ضرور اِن لوگوں کو نہیں چھوڑنا مگر اِن کو راہِ راست پر لانا یہ آپ کی ذمہ داری ہے، ایسا نہیں فرمایا۔ فرمایا کہ قرآن نازل ہوا ہے اُس میں تو خدا سے ڈرنے والوں کے لئے نصیحت ہے اور آپ پر یہ کوئی ایسی مشقّت نہیں ہے کہ جو لوگ نہ بھی مانیں تو اُن کو منوانے کے لئے آپ ہر طرح سے مشقّت اُٹھائیں۔

قرآن کا نزول اُس ذات سے ہے جس نے آسمانوں کو پیدا کیا جس نے بلند آسمانوں کو پیدا کیا: ''اَلرَّحۡمٰنُ عَلَى الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰى'' (۲۰:۵) رحمان وہ خداوند ہے جو عرش پر حکمران ہے۔ اِس میں عرش سے متعلق بہت سے علمائے دین کے درمیان اختلاف ہے، کچھ لوگ یہ فرماتے ہیں کہ خدا عرش پر قائم ہے، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ایسا ناممکن ہے کیونکہ خدا کوئی مادّی شئی نہیں ہے، وہ تو خدا ہے جس نے ہر چیز کو قائم رکھا ہے، وہ خود ایک تخت پر بیٹھے یہ کس طرح ہوسکتا ہے یہ مادّیت کا تصوّر ہے، تو اِن لوگوں کا یہ تصوّر صحیح ہے مگر یہاں پر ایک تاویل ہے، وہ یہ کہ عرش ایک درجہ ہے، عرش ایک طاقت ہے، عرش قلمِ الٰہی ہے اور عرش عقلِ کُلی ہے جو حدودِ دین میں سب سے اُوپر کا درجہ ہے۔ لہٰذا ''اَلرَّحۡمٰنُ عَلَى الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰى'' کا یہ مطلب ہے کہ درجۂ عرش پر مساوات رحمانی ہے، اِس کے معنی یہ ہے کہ جس طرح سب لوگ مانتے ہیں، کہ دُنیا میں جتنی رُوحیں آئی ہیں تو اِن رُوحوں کے یہاں آنے کے ساتھ ساتھ اِن کے درمیان فرق و تفاوت پیدا ہوگیا۔ لیکن جہاں یہ رُوحیں ازل میں تھیں تو اُن کا ایک ہی مرتبہ تھا وہ ایک جیسی تھیں اور اِسی طرح یہ بھی ہے، کہ خداوندِ عالم کا لوگوں سے پوچھنا اور عذابِ آخرت اور ثوابِ بہشت یہ سب کچھ صحیح ہے۔ لیکن آخر میں جا جا کر جہاں رُوحیں خداوندِ عالم کے نور میں واصل ہو جاتی ہیں تو اُس وقت یہ فرق و تفاوت اُٹھ جاتا ہے۔ اِس سے یہ معلوم ہوا کہ رُوحیں ازل میں بھی ایک جیسی تھیں اور ابد میں بھی جا کر ایک جیسی ہوں گی، تو ازل میں اور ابد میں ارواح جیسی تھیں وہ مساواتِ رحمانی کی بات ہوئی۔

اب بات کے دُوسرے مرحلے میں آیئے، اگر ہم رُوحانیت کو مکان و زمان سے بالاتر تسلیم کرتے ہیں تو پھر اب بھی ازل اور ابد موجود ہیں۔ کیونکہ ازل کچھ ماضی کا نام تو نہیں ہے اور ابد کچھ مستقبل کو نہیں کہا جاتا ہے، ازل اور ابد ایک ایسی رُوحانی حقیقت ہے جو کہ بجائے خود اور ہمیشہ اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ اِس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک طرح سے دیکھا جائے، تو اب بھی رُوحیں خدا کے نور میں موجود ہیں کہ وہ رُوحیں وہاں سے آئی ہی نہیں۔ کیونکہ اُن کے لئے وہ ازل ہے اور دوسرے اعتبار سے کہیں تو غلط نہیں کہ ہماری رُوحیں کبھی کی ابد میں جا چکی ہیں اور خدا سے واصل بھی ہوئیں ہیں اور تیسری مثال اِس

طرح سے ہے کہ ایک مقام ایسا ہے رُوحانیت میں کہ وہ ازل بھی ہے اور ابد بھی ہے۔ وہ ازل بھی ہے اور ابد بھی ہے اِس لئے رُوحیں وہاں ازلی طور پر بھی اور ابدی طور پر بھی اپنی جگہ پر اور اپنے اصل میں واصل ہیں، یہ ہوا مساواتِ رحمانی اور وہ عرش پر ہے یا یوں کہا جائے کہ جو رُوحیں عقلِ کل سے مل جاتی ہیں اور علم و حکمت کی روشنی اُن کو حاصل ہے تو وہ عرش سے قریب ہیں یا کہ حاملانِ عرش کے ساتھ مل کر ہیں، لہٰذا وہ مساواتِ رحمانی میں ہیں۔ جیسے سورۂ مومن میں ہے کہ وہ فرشتے جو عرش کو اُٹھائیں ہوئے ہیں (۶۹:۱۷) اور وہ فرشتے جو عرش کے گرداگرد ہیں (۴۰:۷)۔ دیکھیں کہ عرش بھی خالی نہیں ہیں، عرش سے ملحق فرشتے ہیں جو اُٹھا رہے ہیں اور عرش کے گرداگرد بھی فرشتے ہیں یا عرش کو اُٹھانے والے فرشتے سے مراد وہ ایک معرفت ہے، وہ ایک علم ہے، وہ توحید ہے۔ خدا اگر کسی تخت پر ہے تو وہ توحید کا تخت ہے، خدا ایک تصوّرِ توحید ہے، خدا ایک نور ہے، خدا ایک حقیقت ہے، خدا ایک (unity) ہے، خدا ایک قانون ہے، خدا ایک علم ہے، خدا حقیقت الحقائق ہے یعنی ایک ایسی حقیقت جو کہ تمام حقیقتیں اپنی اندر سموئی ہوئی ہیں، ساری حقیقتیں اُس سے وابستہ ہیں، سب حقیقتیں اُس سے الگ نہیں ہیں، وہ ایک ہے مگر سب ہے۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ اُس ذات کی بادشاہی ہے وحدت پر اور کثرت پر کہ اگر خدا وحدت ہوتا خدا (unity) ہوتا تو کثرت اُس کے سامنے مدِمقابل ہو جاتی، تو خدا ایک (opposite) اور ایک ضد ہوتا کہ اُس کے سامنے ایک ضد ہے۔ خدا اگر عادل کہلاتا حقیقت میں تو اُس کے سامنے ایک ظالم کھڑا ہوتا اور خدا اِس معنیٰ میں ظالم کا مدِمقابل ہوتا۔ مجھے کہنے کی اجازت ہو اور میں یہ کہہ کر رہوں گا خدا اگر نور ہوتا تو ظلمت اُس کے سامنے آتی، تقاضا یہ ہوتا کہ نور ہو تو ظلمت اور ظلمت ہو تو نور یعنی نور کا قیام ظلمت پر۔ اندھیرا نہ ہوتا تو نور کا کام کیا ہوتا اور کس طرح ہوتا، بلیک بورڈ نہ ہوتا تو چاک لکھ نہیں سکتا، سفیدی کا وُجود سیاہی پر ہے۔ یہ بات نہیں ہے، خدا اِس سے بھی برتر ہے۔ آپ کا ہمارا اور مومنین کا نور جہاں ایک مرکز پر جلتا ہے تو اُس جلنے کی کیفیت کو خدا اپنی ذات سے منسوب کر کے کہتا ہے کہ میں نور ہوں۔ اِس طرح توحید کی گنجائش ہے اور یہی معنیٰ ہیں، کہ یہ نور کبھی خدا سے منسوب ہوتا ہے کسی وجہ سے، کبھی رسولؐ سے، کبھی امامؑ سے اور کبھی مومنین سے۔ اصل میں نور جلنے کو کہتے ہیں اور وہ جلنا کئی طرح سے ہے محبّت سے جلو، کام کی محنت سے جلو، قربانی سے جلو، چاہنے سے جلو اور غور و فکر سے جلو، علم کی تلاش میں جلو، جلو جس طرح سے بھی جلنا ہے اور نفس کی تحلیل کرو، نفسِ امّارہ کو (dissolve) کرو یہ نور ہے، رات کو اُٹھتے ہوئے جلو، سردی کو برداشت کرتے ہوئے جلو، گرمی کو برداشت کرتے ہوئے جلو، گریہ وزاری کرتے ہوئے جلو اور نفس کو فرسودہ کرو، فرسودہ کرو اور مجموعی طور پر دنیا کے اندر جتنے مومنین ہیں اور اُن کی رُوح جس طرح فرسودہ ہو جاتی ہے، گھس جاتی ہے یا جل جاتی ہے اِس سے نور بن جاتا ہے اور چونکہ یہ امام کے درجے میں یہ کیفیت ہوتی ہے اِس سے نیچے نہیں۔ لہٰذا امامؑ کی ہستی میں یہ بات ہوتی ہے ہماری سب کی رُوحیں جا جا کر امام میں جلتی ہیں۔ وابستگی ہے، عقیدت ہے، محبت ہے تو ہماری [روحیں] وہاں جا کے جلتی ہیں اور وہاں نور بنتا ہے۔ کبھی آپ نے یہ نہیں سنا کہ مومن

کے لئے ہماری آنکھوں میں جگہ ہے۔ اِس کے کچھ معنی ہیں یا معنی سے خالی ہے۔ کیسے ہوسکتا ہے کہ امام کی بات ایک ہی پہلو سے معنی رکھے اور اُس کا دوسرا کوئی پہلو نہ ہو۔ امام کی آنکھوں میں مومن کے لئے جگہ اِس (sense) میں ہے کہ رُوح وہاں جل کر شعلہ مہیا کرتی ہے۔ امام نے یہ بھی فرمایا کہ تم ہمارے لشکر ہو اور جو اسپیشل بندگی کرنے والے ہیں اُن کو لشکر کا نام دیا۔ آپ کے سامنے کوئی جنگ نہیں ہے، کوئی محنت نہیں ہے، کوئی مشقّت نہیں ہے تو کیسے لشکر ہو سکتے ہیں؟ اور بہت ہی اچھی بات ہے شاید وہ بات اِسی سورے کے اندر ہے یا دوسری جگہ پر ہے، تو میں زبانی طور پر بتاؤں گا کہ جب موسیٰؑ وادیٔ ایمن میں آئے تو اُن کو ایک روشنی نظر آئی اور اِس روشنی کی تلاش میں گئے تو روشنی نے ندا کی کہا کہ اِس آگ میں جو بھی ہیں وہ بڑے مبارک ہیں اور جو اِس کے گرد ہیں وہ بھی مبارک ہیں (۲۷: ۷۔ ۸) یہ اشارہ تھا کہ آگ یعنی نور رُوحوں کے جلنے سے بنتا تھا۔ بہت ہی شاندار بات ہے اور یہ ایسی بات ہے کہ دنیا بھر کی عام کتابوں کو پھول سمجھ کر اور پھول کی پنکھڑیاں سمجھ کر نچوڑیں گے تو اُس میں سے عطر کا ایک قطرہ بھی، ایک بوند بھی پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن جہاں امامؑ کا علم ہے، اسماعیلی مذہب کا علم ہے، اُس کی یہ شان ہے کہ اُس کی ایک ایک بات ہزاروں کتابوں سے بڑھ کر ہے۔ لہٰذا یہ بات جو آپ کے سامنے اِس وقت بتائی جاتی ہے۔ بہت اہمیت والی بات ہے اور اِس سے اُونچی کوئی بات ہی نہیں کہ جب انسان کا درجہ خدا کے درجے سے مل جاتا ہے تو وہیں پر تعلیم انتہا کو پہنچتی ہے، گنجِ مخفی کی بات ہو جاتی ہے اور اگر کوئی دوسری بات ہے، تو اِسی کی تشریح ہے یا اِسی کو (repeat) کرنا ہے تو دوسری بات ہے نہیں۔ خدا کو خدا ماننا اور اُس کی تعریف کرنا سب سے بڑی بات تھی۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ انسان، مومن خدا سے ملا ہوا ہے اور پھر اِس کے بعد کوئی دوسری تعلیم ہے نہیں۔

بہر حال جب ہم رسول کو پاک مانیں گے تو اِس کا فائدہ ہم کو خود کو ہے اور کھڑکی کے شیشے جتنے صاف اور ستھرے ہوتے ہیں تو اُس میں بنگلے سے باہر کی دُنیا نظر آتی ہے۔ رسولؐ کی ذات شیشے کے مانند ہے لیکن جو لوگ صحیح نظریات نہیں رکھتے ہیں وہ گویا کہ اُس شیشے کو اپنے خیالات سے داغ دار بنانا چاہتے ہیں۔ ہم ایسا نہیں کرتے ہیں اُس کو پاک اور پاکیزہ مانتے ہیں اور اِس پاکیزہ تصوّر کی بدولت ہم آگے کو دیکھ سکتے ہیں۔ دُنیا میں انسانِ کامل ایک دُوربین کی طرح ہے، وہ عینک کی طرح ہے اور وہ اُس شیشے کی طرح ہے جو بنگلے میں لگا ہوا ہوتا ہے، اُس کا صاف ہونا اور صاف رکھنا ضروری ہے۔ ہم نظریاتی طور پر انسانِ کامل کو پاک اور پاکیزہ مانتے ہیں اور اِس کا ہم کو فائدہ ہوتا ہے، کہ آگے کو دیکھ سکتے ہیں اور دُور تک دیکھ سکتے ہیں۔ جن جن لوگوں نے آج دنیا کے اندر انسانِ کامل کو مکدّر بنایا ہے اور اُن کی نگاہیں انسانِ کامل کی بشریت پر جمی ہوئی ہیں تو وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکتے ہیں اور کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے ہیں۔

اِس سلسلے میں یہاں ایک آٹھویں آیت ہے اُس میں ارشاد ہے کہ: اچھے نام جو ہیں وہ خدا کے ہیں (۷: ۱۸۰) یعنی اسماء الحسنیٰ جو ہیں وہ خدا کے ہیں۔ بہت سے لوگ جیسے بھی خدا کے نام ہیں، اُن سب کو اسمائے حسنیٰ قرار دیتے ہیں

لیکن اِس بارے میں اسماعیلیوں کا جو تصوّر ہے کچھ مختلف ہے۔ وہ تو خدا کے زندہ ناموں کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور جس طرح خدا کی ایک بولنے والی کتاب کو مانتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ خدا کا جو قلم ہے وہ دُنیا والوں کے قلم سے بالکل مختلف ہے، وہ تو ایک زندہ حقیقت ہے، وہ تو ایک فرشتہ ہے اور سب سے عظیم فرشتہ ہے، اِسی طرح کتابِ ناطق کو وہ تسلیم کرتے ہیں یعنی امام کو، اور بہت سے صوفی آنحضرتؐ کو قرآنِ مجسّم مانتے ہیں اور قرآنِ ناطق مانتے ہیں۔ اِسی طرح ائمہ حضرات خدا کے نام ہیں جو زندہ نام ہیں اور یہ بہت بڑی بات ہے، کہ خداوندِ عالم نے اسمائے حسنیٰ کا تصوّر دیا ہے اور یہ فرمایا کہ تم جب بھی مجھے پکارنا چاہتے ہو تو اُس وقت مجھے اچھے اور خوبصورت ناموں سے پکارنا اور اسماعیلیوں کے لئے اِس سے بڑھ کر کوئی دلیل نہیں ہے، کہ جہاں امام خدا کا زندہ نام ہے تو اِس آیت کے بموجب امامؑ کے توسّط سے امامؑ کے وسیلے سے خدا کو پکارنا ہوتا ہے اور ہر حالت میں عبادت و بندگی امامؑ کے توسّط سے ہو جاتی ہے۔ یہ بات آج کی نہیں ہے بلکہ حضرت امام جعفر الصادق علیہ السّلام نے اپنے زمانے میں اِس آیت کی تشریح کی یہ تھی کہ امامؑ کے توسّط کے بغیر کوئی قبولیت نہیں ہے۔

چلیے یعنی لگے ہاتھ اِس آیت کو لیتے ہیں جہاں قرآن میں ہے اسمائے حسنیٰ سے متعلق کیونکہ وہ بہت ہی اہم ہے، اُس کی تشریح بہت ہی ضروری ہے۔ یہ آپ کو آیت ملے گی (۷:۱۸۰) اور بہت ہی عالی شان فرمان ہے جو خداوندِ عالم نے فرمایا وہ یہ ہے: ”بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○ وَلِلّٰهِ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى فَادۡعُوۡهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيۡنَ يُلۡحِدُوۡنَ فِىۡۤ اَسۡمَآئِهٖ سَيُجۡزَوۡنَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ“ اور اچھے اچھے نام خدا ہی کے خاص ہیں، تو اُسے ان ہی ناموں سے پکارو اور جو لوگ اِس کے ناموں میں کفر کرتے ہیں اُنہیں اُن کے حال پر چھوڑ دو، اور وہ بہت جلد اپنے کرتوت کی سزا پائیں گے۔ یہ ہے کہ خدا نے اِس معنیٰ میں یہ فرمایا، کہ زمانے کا امام ہی ہے جو خداوندِ عالم کا مبارک نام ہے، اور اُسی کے وسیلے سے پکارا کرو اور جو لوگ ناموں کو نہیں سمجھتے ہیں اُن کو اُنکے حال پر چھوڑ دو، اُن کو سکھانے سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی اُن سے بحث کرنے کی ضرورت ہے اُن کو اُنکے حال پر چھوڑ دو: ”وَذَرُوا الَّذِيۡنَ يُلۡحِدُوۡنَ فِىۡۤ اَسۡمَآئِهٖ“ (۷:۱۸۰) جو لوگ اُس کے ناموں کو نہیں جانتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جو خداوند عالم کے ظاہری نام ہیں اُن کو نہیں سمجھتے ہیں یا یہ کہ امامؑ ہی خدا کا اسمِ اعظم ہے اُسی کو نہیں سمجھتے ہیں اور امامؑ خدا کا سب سے بڑا نام ہے، اور اسمِ اعظم ہے تو تم لوگ امام کے وسیلے سے خدا کو پکارا کرو اور جو لوگ اِس خدا کے نام کو یعنی امام کو نہیں جانتے نہیں پہچانتے ہیں، تو اُن کو چھوڑ دو اور وہ اپنے عمل کی سزا کو پہنچیں گے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اِس کا بدلہ کل کو ملے گا۔

اُسی کے ساتھ ساتھ مربوط آیت ہے: ”وَمِمَّنۡ خَلَقۡنَاۤ اُمَّةٌ يَّهۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَبِهٖ يَعۡدِلُوۡنَ“ (۷:۱۸۱) اور ہم نے جو کچھ پیدا کیا یا جن لوگوں کو پیدا کیا اُن میں سے ایک اُمت ہے، ایک گروہ ہے کہ وہی گروہ سچّائی پر ہدایت کرتا ہے اور اُسی سچّائی سے عدل کرتا ہے۔ اب دیکھیں کہ خدا کی آیات ایسی ہیں، کہ بعض دفعہ اُس کے اندر اور اکثر

اُصولات پر ذکر ہوتا ہے اور خدا کی بات کا اطلاق زمانۂ آدم سے لے کر قیامت تک ہوتا ہے۔ جیسے یہاں فرمایا کہ ہماری مخلوقات میں سے ایک اُمت ہے جو کہ لوگوں کی رہنمائی کرتی ہے، خدا نے جیسے فرمایا کہ ہماری مخلوقات میں سے ایک اُمت ہے، کہ وہ اُمت یعنی گروہ حق کے وسیلے سے ہدایت کرتا ہے، اُس اُمت کے پاس اُس گروہ کے پاس حق ہے حق، سچّائی، صداقت ہے۔ اُسی صداقت کی بدولت وہ رہنمائی کرتا ہے اور اُسی صداقت سے عدالت کرتا ہے، تو یہ کونسا گروہ ہے اماموں کا گروہ ہے۔ زمانۂ آدم سے لے کر قیامت تک جتنے امام ہیں اُن کا اِس میں ذکر ہے اور زمانۂ آدم سے لے کر قیامت تک جتنے لوگ دُنیا میں آچکے ہیں اور آرہے ہیں اور آئیں گے اُن کا اِس میں ذکر ہے۔ اِس تشریح کے بعد میں دوبارہ اِس آیت کو پڑھتا ہوں: ''وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ'' اور ہماری مخلوقات سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دینِ حق کی ہدایت کرتے ہیں اور حق ہی سے انصاف کرتے ہیں۔

زادان نے حضرت علیؑ سے روایت کی ہے کہ: عنقریب اِس اُمت کے تہتر (۷۳) فرقے ہوں گے، اُن میں سے بہتّر جہنمی ہوں گے اور ایک جنتی۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ'' اور یہ لوگ میں اور میرے شیعہ ہیں۔ دیکھو کتاب علامہ ابن مردویہ۔ یعنی امام اور اُس کے دوستدار وہی لوگ ہیں جن کی یہاں تعریف کی گئی اور دوسری کتابوں میں اِس گروہ سے حضراتِ ائمہ مراد ہیں۔ امام اوّل سے لے کر آخر تک ایک اُمت کہلاتے ہیں، اُمت گروہ کو کہا جاتا ہے، اُمت کا (literal) مطلب ہے گروہ، تو یہاں اماموں کی تعریف ہے، وہی حق اور حقیقت پر ہدایت کرتے ہیں۔ جیسے آنحضرت ﷺ نے اپنی ایک حدیث میں فرمایا کہ: خداوندا! حق کو علی کے ساتھ کردینا جہاں وہ گھومیں حق بھی اُن کے پیچھے پیچھے چلے، تو یہ حق اماموں کے ساتھ ہے اور وہ گروہ ائمہ حضرات ہیں جن کو خدا نے لوگوں کی ہدایت کے لئے اوّل سے لے کر آخر تک مقرّر کیا یعنی سلسلۂ امامت کی بات ہے، تو اِس کے اُوپر اسمائے حسنیٰ کی بات تھی خدا کے اچھے اچھے ناموں کی بات تھی اور وہ خدا کے جو اچھے نام ہیں وہ ائمہ حضرات ہیں اور اُسی سے مربوط یہ ہدایت ہے۔ ''وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ'' (۱۸۲:۷) اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں تو اُن کو آہستہ آہستہ ہم جہنم میں لے جائیں گے، انہیں خبر بھی نہ ہوگی۔ آیات کے متعلق مولا علیؑ کا ارشاد ہے، کہ آیات سے مراد یعنی خدا کی آیات جو ہیں ائمہ ہیں، امام ہی خدا کی آیات ہیں اور دُنیا کے اندر قرآن کی آیتوں کی کوئی تکذیب نہیں کرتا ہے اور امام کی تو تکذیب کرتے ہیں یعنی امام کو تو جھٹلانے کے لئے کوشش کرتے ہیں اور اپنے طور پر وہ جھٹلاتے ہیں اور آیت نشان کو کہا جاتا ہے اور خدا کے سب سے بڑے نشان امام ہیں، تو یہ ہیں کچھ باتیں قرآن کے سلسلے میں۔ آج معلوم نہیں کس موضوع پر بولنا تھا، لیکن میں نے کچھ جنرل باتیں بتائیں اور اِن شاء اللہ یہ باتیں بھی بہت اہم ہیں اور آپ کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہیں، شکریہ۔ اب میں اپنے درس کو یہیں پر ختم کرتا ہوں، شکریہ۔

انہوں نے ایک بہت اہم سوال کیا کہ ہم نے جو عرش رحمان سے متعلق مساواتِ رحمانیہ کا ذکر کیا، انہوں نے سوال یہ اُٹھایا کہ حدود میں عقلِ کُلی، قلمِ الٰہی کے تحت ہیں تو کیا یہ عقلِ کُلی کے تحت جو نفس کُلی ہے تو اُس کے لئے مساواتِ رحمانیہ کے بارے میں کس طرح سوچا جائے۔ اِن کا سوال بڑا اہم بھی ہے اور بہت اتفاق سے اُونچا بھی ہے، لیکن یہ ہے کہ تعلیمات دو قسم کی ہیں، ایک توحید کی تعلیم ہے اور ایک قسم کی تعلیمات حدودِ دین کی ہیں۔ مگر آخری تعلیم حدودِ دین کی تعلیم نہیں ہے، آخری تعلیم توحید کی تعلیم ہے، پہلے حدودِ دین کی تعلیم آتی ہے کہ اُس میں مراتب ہیں درجات ہیں اور ہم درجات کو تو مانتے ہیں ابھی ابھی درجات کی بات ہوئی اور سب سے آخر میں جو تعلیم آتی ہے اُس سے اُوپر کوئی تعلیم نہیں وہ مساوات اور توحید کی تعلیم ہے۔ مساوات اور توحید کا مطلب ایک ہے، تو اِس کے لئے یہ ہے کہ جس طرح ہم یہ مانتے ہیں کہ ہم اُس ازلی مقام سے جیسے دنیا میں آئے ہیں، تو اُس کے ساتھ ساتھ ہماری ایک انا وہاں ہمیشہ سے قائم ہے۔ بالکل اِسی طرح سے جب ہم مانتے ہیں کہ یہ نفس کلی عقل کلی سے پیدا ہوا ہے تو لازمی بات ہے کہ نفس کلی کی ایک حیثیت بھی تو وہاں اپنی جگہ پر قائم ہے۔ تو جو نفس کلی کی حیثیت عقلِ کُلی سے وابستہ ہے یا اُس کے ساتھ ہے یا مساوات کے درجے پر ہے، تو اُس میں سب مومنین کے ساتھ وہ برابر ہے۔ کیونکہ تاویل کے اندر یہ بات بتائی جاتی ہے، کہ جس بہشت کا وعدہ متقی لوگوں سے کیا گیا ہے اُس کے اندر چار نہریں ہیں جو اُس جنّت کے تحت ہیں۔ پھر تاویل میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ عقلِ کُلی، نفس کُلی، ناطق اور اساس بہشت کی چار نہریں ہیں۔ جہاں یہ بہشت کی نہریں ہیں تو جن کو وہ مقام ملتا ہے، وہاں اِن حدود سے اِس قدر قریب ہو جاتے ہیں، کہ وہ اِن سے مل کر ایک ہو جاتے ہیں اور اِس بات کو ذرا سوچا جائے، تو قبول کرنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوگی مومن کے لئے کیونکہ جب درجات میں سے سب سے اُونچا درجہ خدا کا ہے اور خدا گنجِ مخفی کی طرح مومن کی ملکیت بن جاتا ہے اور خدا کے ساتھ مومن کی (unity) ایک ہو جاتی ہے تو لازمی طور پر وہاں نفس کُل، عقلِ کُل، ناطق اور اساس سب درجات ایک ہو جاتے ہیں، اِس (sense) میں یعنی گنجِ مخفی ملتا ہے اور ایسی باتیں وقوع میں آتی ہیں کہ جن کے متعلق ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے، ہماری کوئی توقع بھی نہیں تھی، تو وہ مقام اِس قدر اُونچا ہے اور آپ کا سوال نفس کُل کے بارے میں تھا کہ نفس کُل بھی لازمی طور پر وہاں اُس مساوات میں ایک ہے، جہاں رُوحوں کو عرش کے ساتھ، خدا کے ساتھ ایک ہو جانا ممکن ہے تو لازمی طور پر نفس کُل کے ساتھ بھی وہ ایک ہو جاتے ہیں، اور حدود نے اپنے اصل مقام کو چھوڑ کے دُنیا کی رُوحوں کو بلند کرنے کے لئے یہ درجات قبول کیا۔ مثال کے طور پر خدا جس سیڑھی کا تصوّر دیتا ہے اگر اُس سیڑھی سے مراد حدودِ دین ہیں، تو رُوحیں حدودِ دین کی سیڑھی سے چڑھتی ہیں، حدودِ دین کی سیڑھی سے چڑھتی ہیں۔ یعنی رُوحانیت کے جتنے درجات ہیں اُن درجات سے گزرنا ہوتا ہے یہاں تک منزلِ آخرین آتی ہے جو خدا ہے وہ منزلِ آخرین ہے، تو اِس میں مساواتِ رحمانیہ ہو جاتی ہے: ”مَّا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَٰنِ مِن تَفَاوُتٍ“ (۶۷:۳) یہ سورۂ ملک میں ہے، اے

رسولؐ آپ اپنی نگاہ کو دوڑا ییئے حقیقت کی طرف اور خدا کے درجے کی طرف دیکھیں۔ ''مَّا تَـرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡـمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ'' جو رحمان کی مخلوق ہیں اُن کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے یعنی ایک مقام ایسا بھی ہے، کہ اُس مقام پر جو مخلوق ہے اُن کو خلق رحمان کہا جاتا ہے اور جن کو صحیح معنوں میں خداوند نے، احسن الخالقین نے پیدا کیا ہے۔ خدا کی تخلیق کا اطلاق اِس دنیا میں، اِس صورت میں، اِس جہان میں، اِس جسم کے ساتھ، اِس نفس کے ساتھ اور اِن آلائشوں کے ساتھ ابھی اطلاق نہیں ہوتا۔ یعنی دُنیا کے بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ ابھی اُن کو خدا نے پیدا ہی نہیں کیا اور پیدا اُس وقت کرے گا کہ یہ رحمان کی مخلوق کہلائیں گے اور اُس [وقت] موجود بحق ہوں گے۔ خدا نے یہ بھی فرمایا تھا نا کہ میں نے انسان کو اِس لئے پیدا کیا کہ وہ مجھ کو پہچانے اور جب لوگ خدا کی پہچان کے قابل ہو جائیں گے تو تب مانا جائے گا، کہ خدا نے اُن کو صحیح معنوں میں پیدا کیا یعنی اِس تخلیق کا مقصد معرفت تھی، تو معرفت کے مقام پر جائے بغیر کس طرح کوئی مخلوق کہلا سکتا ہے یعنی رحمان کی مخلوق۔ یہ مساواتِ رحمانی ہے، مونوریا لازم ہے اور وہ ایک حقیقت ہے، جیسے امامؑ نے ارشاد فرمایا تو وہ بالکل حقیقت ہے۔

سورۂ نور کے اندر اِنہوں نے بڑی دقتِ نظر سے اِس سوال کو آگے کیا اور بہت اہم سوال ہے، ماشاء اللہ ہمارے عزیزان بہت اہم سوالات پیش کرتے ہیں، ایسے سوالات کوئی دنیا کا فلاسفر پیش نہیں کر سکتا ہے۔ یہ ہے کہ نور میں دُوئی نہیں ہے وہ ایک ہے، جب ہم نور کو نور کے طور پر مانیں تو اُس میں دوئی نہیں ہے، جب نور کے ساتھ ساتھ ہم شخصیت کو بھی مانیں تو شخصیت کے اعتبار سے شخصیت کو نور کہیں وہ بھی نور ہے، تو اُس وقت میں نورٌ علیٰ نور کہنا صحیح ہے۔ سورج کو اگر آپ آسمان پر دیکھتے ہیں تو اُس میں دوئی نہیں ہے، سورج کو اگر آپ کسی صاف پانی میں اور (mirror) میں اور ایسی چمکدار چیزوں میں دیکھتے ہیں تو اُس میں دوئی ہے، تو یہاں دوئی عارضی ہے اور وحدت حقیقی ہے۔ اِس طرح شخصیات میں جائیں گے تو نورٌ علیٰ نور صحیح ہے اور اصل میں جائیں گے تو وہ ایک ہی نور ہے جو آسمان و زمین کا نور ہے، کہ بہت سی اُونچی حقیقتیں ایسی ہیں کہ اُن کے دو دو، تین تین، چار چار، دس دس پہلو ہیں۔ لیکن اُن پہلوؤں کے الگ ہونے میں اِن کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا تو ہر پہلو الگ ہے اور اُس کی توجیہہ ہوتی ہے، یہ کہ نورٌ علیٰ نور شخصیت کے بغیر ممکن نہیں ہے اور ایک نور باطنی پہلو سے ایک نور ہے۔ اِسی طرح خدا دو ہوتے تو آسمان زمین میں فساد ہوتا، سے مراد یہ ہے کہ خدا کی صفات، خدا کا ارادہ اور خدا کا قول، خدا کا فعل اِس میں دوئی کی بات ہے۔ مثلاً کوئی رُوح، ہم شریعت کے (level) سے بات کرتے ہیں یا صوفیوں کی بات کرتے ہیں، کوئی رُوح اصل سے واصل ہو جاتی ہے تو اُس کی کیا وجہ ہوتی ہے، اُس میں خدا کی صفات کے خلاف جو تضاد ہے وہ ختم ہو جائے، تو تب یہ رُوح اصل سے واصل ہو سکتی ہے اِس سے پہلے نہیں اور ایک ہونے کا وسیلہ کیا ہے؟ ایک ہونے کا وسیلہ یہ ہے کہ: ''تَخَلَّقُوۡا بِاَخۡلَاقِ اللّٰہِ'' خدا کی عادتیں اپناؤ۔ یعنی تمہارے اندر خدا کی عادتیں اپنانے کی گنجائش ہے یعنی خدا عادل ہے ایک طرح سے، تو تم بھی عدل کو پسند کرو، خدا حق ہے، تو تم بھی حقیقت کو پسند

کرو اور سچ بولو، خدا نیکی کو چاہتا ہے، تو نیکی کرو، خدا ظلم کو نہیں چاہتا ہے، تو ظلم مت کرو، اپنے دائرے کے اندر کرتے کرتے خدا کی عادتیں جب اپنائی جائیں گی تو اِس سے (unity) ہو جائے گی اگر خدا کے حضور میں، خدا کے نور میں بہت سی روحوں کے واصل ہو جانے کی گنجائش ہے اور ممکن ہے تو پھر وہی بات ہوئی نا کہ خدا بہت سارے درجات کو کس طرح اپنا تا ہے خدا سے واصل ہو جاتے ہیں، بہت سی رُوحیں اور بہت سے مومنین بہت سے فرشتے خدا میں فنا ہو جاتے ہیں ۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا ایک طرح سے ایک ایسی حقیقت ہے کہ اُس حقیقت میں کثرت فنا ہو جاتی ہیں ۔ کثرت، کثرت کی کیفیت سے ختم ہو کے اُس کے ساتھ کثرت وحدت بن جاتی ہے، جس طرح جب سورج طلوع ہوتا ہے تو رات کی تاریکی ختم ہو کر روشنی میں تبدیل ہو جاتی ہے، کوئی قطرہ سمندر میں جا گرے تو پھر وہ قطرہ نہیں رہتا ہے اُس کا کوئی وُجود نہیں رہتا ہے حالانکہ اُس کا وُجود سمندر کا وجود بن جاتا ہے، اُس کی انا سمندر کی انا بن جاتی ہے، اُس کی اپنی کوئی مثال وہاں نہیں کیونکہ اُس کے لئے کوئی گنجائش نہیں کہ پانی کے اندر قطرہ قائم رہے، تو اگر مان لیا جائے کہ خدا کے اندر خدا کی ذات میں بہت سی رُوحیں مدغم ہیں، تو اُن میں کوئی تضاد نہیں ہے ۔ یعنی مطلب اِس کا یہ ہوا کہ خدا جیسا خدا کوئی ہوتا تو خدا کے ساتھ ایک ہوتا، اُس میں دوئی باقی نہیں رہتی، اگر خدا دوسرا ہوتا اور اُس کی صفت الگ ہوتی تو وہ آپس میں نہیں ملتے اور اِس نہ ملنے سے آسمان اور زمین کے اندر فساد ہو جاتا اِس لئے کہا کہ خدا دو نہیں ہو سکتے اور ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' (۱۱۲:۱) کے جہاں معنی ہیں وہ دو طرح سے ممکن ہیں یا یہ کہ اِس میں سب کی نفی ہے اور ایک کا اثبات ہے ۔ اِس (sense) میں کہا گیا ہے کہ یہ بھی نہیں، وہ بھی نہیں، وہ بھی نہیں، وہ بھی نہیں، ایک ہے یا یہ ہے کہ اِس میں بہت سی حقیقتوں کو ایک ماننے کے لئے فرمایا گیا ہے ۔ ہم دُنیا کی مثال میں کہتے ہیں چھوٹی سطح پر اور نچلی سطح پر ہم ایک ہیں، اِس کے یہ معنی نہیں ہوتے ہیں، کہ ہم بہت ساروں کی نفی کر کے کسی ایک کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، یہ نہیں! ایک کہنے کے دو معنی ہیں، ایک مطلب یہ ہے کہ سب کو ایک مان لیا جائے اور دوسرا مطلب یہ ہے سب کی نفی کر کے سب کو نیست و نابود قرار دے کر ایک کو تسلیم کیا جائے، تو توحید دو طرح سے ہے ۔ ہمارے یہاں جہاں مونوریالزم کا تصوّر ہے اُس میں یہ ہے کہ سب حقیقتیں ایک ہیں اُن میں دوئی کی کوئی گنجائش نہیں تو اُسی کو سمجھنے کے لئے اور سمجھانے کے لئے ہم کوشش کر رہے ہیں ۔ مہربانی ۔

ٹائپنگ: شاہ وزیر علی　　　نظرِ ثانی: اکبر علی　　　پروف: نسرین اکبر

Click here
for Audio

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُرحکمت بیان

عنوان: قرآن میں تصورِ ایمان اور اس کا دوسرے موضوعات سے ربط

کیسٹ نمبر: Q-19 تاریخ: ۲ر فروری ر ۱۹۸۲ء کراچی

اگلی کلاس میں ہم نے اللہ پاک کے ناموں کے سلسلے میں بات چیت کی تھی، تو آج ایمان کے بارے میں کچھ بات چیت کریں گے، چنانچہ واضح ہو کہ ایمان کے لغوی معنی باور کرنے کے ہیں اور پھر اِس کے اصطلاحی معنی ہیں جو کہ خدا اور رسولؐ کے ارشادات پر یقین رکھنے یا باور کرنے کو کہا جاتا ہے، اور اِس کے علاوہ ایمان کے مختلف درجات میں مختلف معنی ہوتے ہیں، اور وہ کسی بھی مقام کے مطابق تعیّن ہوسکتا ہے کہ اس ایمان سے کیا مراد ہے، اور جاننا چاہیئے کہ ایمان بھی قرآن اور اسلام کے دوسرے بڑے موضوعات کی طرح ہمہ گیر اور جامع ہے، پس ایمان کے موضوع سے دین کی کوئی اہم چیز باہر نہیں ہوسکتی ہے، اسی طرح یہ پورے قرآن میں محیط ہے، یعنی ایمان کا موضوع تمام قرآن میں پھیلا ہوا ہے، اور جو لوگ دینِ اسلام کو قبول کریں، خواہ اُن کے دل کی کیفیت کچھ بھی ہو، تو وہ لوگ اُن لوگوں میں سے ہو جاتے ہیں جن کو خداوندِ عالم نے "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا" (۵۹:۴) کے خطاب سے مخاطب فرمایا ہے۔

قرآن میں جہاں جہاں ایمان سے متعلق واضح آیتیں ہیں اُن سے ایمان کے موضوع پر روشنی پڑتی ہے، اور اِس سلسلے میں کبھی تو فرمایا جاتا ہے، کہ اے ایمان والوں ایمان لاؤ (۲:۱۰۴) اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے برائے نام ایمان لایا ہے اُن کے ایمان کی مضبوطی اور ترقّی مراد ہوتی ہے، دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ خدا اُن سے فرماتا ہے، کہ اے لوگوں جنہوں نے کلمہ پڑھا ہے، وہ صحیح معنوں میں یعنی جیسا کہ چاہیئے ایمان لاؤ۔ کچھ دوسری آیات سے یہ بھی پتا چلتا ہے، کہ ایمان درجہ بدرجہ آگے سے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ یہ آخری مرحلے پر ایک نور ہے یا کہ ایک نور کی شکل اختیار کرتا ہے جس کو نورِ ایمان کہا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ ایمان جو شروع میں صرف باور کرنے کے معنی میں تھا آگے چل کر یقین کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اگر ہم قرآن میں ایمان کے موضوع کو دیکھیں تو ایمان سے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں، منجملہ یہ کہ ایمان لانا سب سے پہلے خدا پر ہے، پھر رسولؐ پر ایمان لانا ہے اور اس کے بعد اُس نور پر ایمان لانا ہے جسے خدا نے اِس دُنیا میں نازل فرمایا ہے۔ اب ہم اُس آیت کو قرآن میں سے نکال کے بتاتے ہیں، اور وہ آیت یہ ہے جو سورۃ تغابن میں ہے: "فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ" (۸:۶۴) پس ایمان لاؤ خدا پر اور اُس کے رسول پر اور اس نور پر ایمان لاؤ جس کو ہم نے

نازل کیا اور اللہ باخبر ہے تمہارے اعمال سے۔ اِس میں واضح ہے، کہ صرف خدا اور رسولؐ پر ایمان لانے سے ایمان کامل نہیں ہوتا، بلکہ اُس نور پر بھی ایمان لانا ہوتا ہے جس کو خداوندِ عالم نے نازل فرمایا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ نور کیا ہے؟ جب خدا پر ایمان لایا جاتا ہے، تو اُس کی تمام صفات کے ساتھ، اُس کی تمام خوبیوں کے اقرار کے ساتھ ایمان لایا جاتا ہے، جیسے کہا گیا ہے کہ "اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَآئِهٖ وَصِفَاتِهٖ" ہم نے ایمان لایا خدا پر جیسا کہ وہ اپنے ناموں کے ساتھ اور اپنی صفات کے ساتھ ہے، تو اِس میں خدا، اُس کے اسماء اور صفات آ گئیں۔ اسی طرح جب رسولؐ پر ایمان لایا جاتا ہے، تو رسولؐ کی رسالت، آپ کی آسمانی کتاب، اور جس طرح آپ نے اسلام لایا، جیسی آپ کی خوبیاں تھیں، یعنی آپ کی صفات وغیرہ، اِن تمام چیزوں پر ایمان لایا جاتا ہے کیونکہ رسولؐ بہت سی اعلیٰ صفات کا مجموعہ ہیں، تو رسولؐ پر ایمان لانے کی بات پوری ہوئی۔ اب اِس سے معلوم ہوا کہ نور خدا اور رسولؐ کے مرتبے کے علاوہ ہے اور الگ طور پر اِس کا ذکر ہے، کہ یہ نہ تو اسلام ہے اور نہ قرآن ہے اور نہ نبوّت ہے، کیونکہ نبوّت، اسلام، قرآن کا ذکر رسولؐ کے ساتھ ساتھ ہو گیا، تو نور اِس سے الگ ایک حقیقت ہے، اور وہ امامت ہے اور امام ہے، اور "اَنْزَلْنَا" کے معنی ہیں کہ مرتبۂ اعلیٰ سے مرتبۂ ادنیٰ کی طرف بھیجا گیا ہے، یعنی آسمانِ رُوحانیت سے زمینِ بشریت کی طرف نور بھیجا گیا ہے، "اَنْزَلْنَا" یعنی نازل کرنا سے مراد ہے، کہ انسانوں کی آسانی کے لئے کسی عالی قدر چیز کو بلندی سے اتار کے انسانوں کی سطح پر رکھنا، جس طرح قرآن کے نزول سے اِس کی مثال مل جاتی ہے، کہ قرآن قلمِ الٰہی میں تھا، لوحِ محفوظ پر آیا اور لوحِ محفوظ سے آنحضرتؐ کے پاک دل و دماغ پر آیا اور وہاں سے اِس کا ظہور ہوا جو آج کتابی شکل میں اور تحریری صورت میں انسانوں کے سامنے موجود ہے۔ یہ قرآن کے نزول کی مثال ہے کہ اگر یہ قلمِ الٰہی میں اب بھی ہوتا اور لوحِ محفوظ سے اِس کا ایک نقشہ دُنیا میں نہیں آتا، اور آنحضرتؐ کے پاک دل و دماغ سے کسی طرح سے بھی یہ ظاہر نہ ہوتا تو پھر یہ نزول نہ ہوتا، اور لوگ اِس تک رسا نہ ہو سکتے، بالکل اسی طرح جہاں نور کے بارے میں فرمایا جاتا ہے، کہ نور کو ہم نے نازل کیا تم اُس پر ایمان لاؤ، تو جو چیز نازل ہوئی ہے اور جس کے متعلق لوگوں سے فرمایا جاتا ہے کہ تم اِس پر ایمان لاؤ تو وہ نازل ہونے کی صورت میں لوگوں کے سامنے ہے، جس طرح قرآن لوگوں کے سامنے ہے۔ اب اِس آیت سے کئی طرح کی حکمتیں ظاہر ہو جاتی ہیں، ایک عظیم اور بنیادی حکمت تو یہ ہے کہ ایمان کامل نہیں ہو سکتا، جب تک کہ خدا اور رسولؐ کے بعد نور پر ایمان نہ لایا جائے۔ چنانچہ قرآن میں جہاں کہیں بھی ایمان کے بارے میں کوئی حکم ہو، تو اُس میں ہمیشہ کے لئے یہ تین مرتبے پیشِ نظر ہیں، یعنی خدا کا مرتبہ، رسول کا مرتبہ اور امام کا مرتبہ جو نور رہے۔

یہاں پر ایک اور بات یہ بتائیں گے کہ خدا پر ایمان لانا آسان ہے، اِس لئے کہ دُنیا کے اکثر لوگ جو بھی مذہب رکھتے ہیں خدا کو مانتے ہیں، یعنی مذاہبِ عالم کا خدا پر ایمان ہے اور خدا پر ایمان لانے کی نسبت رسول پر ایمان لانا مشکل

ہے، اِس لئے کہ رسول کے ماننے والے، خدا کے ماننے والوں کی نسبت سے بہت کم ہیں، اور پھر رسول پر ایمان لانا آسان ہے بنسبت اِس کے کہ امام پر ایمان لائیں، اور یہی وجہ ہے کہ آج رسولؐ پر ایمان لانے والے بہت زیادہ ہیں اور امام پر ایمان لانے والے رسولؐ کے بعد بہت کم ہیں، تو یہاں ہم کو یہ انسانوں کی عادت سے متعلق ایک علم کا انکشاف ہوا۔ دُوسری حکمت اِس میں یہ ہے، کہ قرآن میں بہت سے اوصاف ایسے ہیں جو خدا، اُس کے رسول اور امام میں مشترک ہیں، اِس لئے پتا نہیں چلتا ہے، کہ ایسی صفت کا مرکز کہاں ہے، جیسے امر کا مالک خدا ہے اور امر کا مالک پیغمبر ہے، پھر امر کا مالک امام بھی ہے، اِس لئے پتا نہیں چلتا ہے کہ امر کا مرکز کہاں ہے۔ جب تک کہ ایک ہی آیت میں اِن تین پاک ہستیوں کا ذکر نہ ہو اور یہ نہ بتایا جائے، کہ امر کا مرکز کون ہے اور کہاں ہے۔ چنانچہ آیۂ اطاعت کو جب ہم سامنے رکھتے ہیں، تو اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا اور رسولؐ نے امام کو امر کا مالک قرار دیا ہے، اِس لئے فرمایا جاتا ہے کہ: "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" (۵۹:۴) یہی مثال نور کی بھی ہے، کہ سورۂ نور میں خدا نے اپنی ذات کو نور قرار دیا۔ اسی طرح قرآن میں یہ بھی ہے، کہ آنحضرتؐ نور ہے، یہ بھی ہے کہ امام نور ہے، مگر اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح امام ہمیشہ لوگوں کے درمیان ہے اور جیسے امام لوگوں کی ہدایت کے لئے ہر زمانے میں موجود ہے اُس کی نسبت سے خدا اور رسولؐ نے امام کو نور کا مرکز بنا دیا ہے۔ جیسے اِس آیت سے ظاہر ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ اے لوگو! تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اُس نور پر جس کو ہم نے نازل کیا ہے، تو نازل لوگوں کی ضرورت کے لئے ہے۔ نور کا نزول لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے ہے جیسے اگر مان لیا جائے، کہ آسمان سے کوئی چیز زمین پر اتر آتی ہے تو اِس کے اترنے میں کوئی مقصد ہے جیسے سورج کی روشنی آسمان سے زمین پر اترتی ہے، جیسے بارش بلندی سے پستی پر آتی ہے، بالکل اسی طرح امام کو خدا نے دُنیا میں بھیجا ہے، لوگوں کی ضرورت سے بھیجا ہے، تو اِس سے معلوم ہوا کہ خدا نور ہے، اِس معنیٰ میں کہ رسول نور ہے، رسول نور ہے اِس معنیٰ میں کہ امام نور ہے، اور یہی وجہ ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ وہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (۳۵:۲۴)۔ مادّی طور پر دیکھا جائے تو آسمان زمین کی کوئی حدِ فاصل نہیں ہے، جہاں بھی ہے (space) ہے، جہاں بھی ہے مکان ہے، اور جو بھی ہے مادّہ ہے، مگر جب ہم رُوحانی طور پر سوچتے ہیں، تو بے شک آسمانوں اور زمین کا پتا چلتا ہے۔ یعنی رُوحانیت کے اعلیٰ درجات آسمان ہیں اور اُس کے ادنیٰ درجات زمین ہیں، چنانچہ یہ انسان اپنے اِس جسم کے ساتھ رُوحانیت کی زمین ہے، یہ اِس معنیٰ میں کہ رُوحانیت کے آسمانوں سے جو فیض حاصل آتا ہے اُس کا رخ ان انسانوں کی طرف ہے، پس امام زمین پر خدا کا نور ہے۔

مگر ایک بات یاد رہے کہ امام آسمان پر بھی ہے، جس طرح قرآن کے متعلق تحریروں میں اور تقریروں میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر قرآن خدا کے قلم سے آیا ہے اور لوحِ محفوظ سے نازل ہوا ہے اور آنحضرتؐ کے دل و دماغ سے ظاہر ہوا ہے، تو

اِن مقامات پر قرآن مٹا ہوا نہیں ہے ۔ یہ قرآن اپنی اصل میں بھی موجود ہے، آپ قرآن میں اسمِ اعظم یا اسمِ اعظم میں قرآن کے اِس موضوع میں دیکھیں، تو آپ کو پتا چلے گا کہ یہ قرآن اِس دنیا میں نازل ہونے کے باوجود کہاں کہاں پر ہے، اسی طرح امامؑ بے شک اِس دنیا میں ظاہر ہے اور وہ نور ہے لیکن اِس کے ساتھ ساتھ وہ رُوحانیت کے آسمان پر بھی نور ہے ۔ جیسے خدا نے سورۂ نور میں فرمایا تھا کہ ''اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ''(۲۴:۳۵) خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے یعنی خدا بیک وقت آسمانوں میں بھی ہے اور زمین پر بھی ہے ۔ اب ہم دیکھتے ہیں، کہ خدا کی طرف سے زمین پر جو نور رہے وہی نور خدا کے نور کی حیثیت سے ہے جو نہ صرف زمین پر ہے بلکہ یہ آسمانوں میں بھی ہے ۔ ایمان کے سلسلے میں کچھ مزید تفصیلات بتانے سے پیشتر نور کی بات ہو رہی ہے، لہٰذا ایک اور بات ہم آپ کو بتانا چاہتے ہیں یا کہ اُس کی طرف صرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں ۔ کئی دفعہ آپ کے سامنے لیکچروں میں اور کتابوں میں یہ بات آچکی ہے، کہ خدا نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ اس نے ایک نور اور کتابِ مبین کو بھیجا ہے (۵:۱۵) تو اِس آیت سے اُس آیت پر روشنی پڑتی ہے، وہ یہ کہ اگرچہ ہم کتاب کے ساتھ جو نور بھیجا گیا ہے اُس سے رسول مراد لیں تو پھر بھی امامؑ ہی ہے جو رسولؐ کے جانشین کی حیثیت سے وہی نور، اسی نور کی حیثیت سے اور اسی جانشینی کی مرتبت میں امام ہی ہے، بہر حال اِس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ جہاں کہیں قرآن میں نور سے متعلق کوئی آیت ہو تو وہ اِس کے ساتھ اور یہ اُس کے ساتھ مربوط ہیں ۔

اب ہم ایمان کے موضوع کو اِس طرح سے سمجھتے ہیں، کہ ایمان کا درجۂ کمال اِس نور پر ایمان لائے بغیر نہیں ہے، اور اِس کو مزید تقویت ملتی ہے اُس آیت سے جس میں فرقان کا ذکر کیا گیا ہے، فرقان کا ذکر کیا گیا ہے، خداوندِ عالم کا ارشاد ہے: ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا وَّیُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ''(۸:۲۹) ۔ دیکھیں کہ کچھ لوگوں نے خدا پر ایمان لایا اور رسولؐ پر ایمان لاتے ہوئے دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے، تو اُن کے سامنے قرآن ہے اور رسولؐ کی ہدایت ہے اور آسمان سے وحی نازل ہوتی ہے، اِس کے باوجود خداوندِ عالم اُن سے فرماتا ہے کہ اے ایمان والوں جنہوں نے کلمہ پڑھا ہے، جو دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں وہ، اگر تم خدا سے ڈرو گے تو تمہارے لئے ایک فرقان یعنی حق و باطل کے درمیان فرق و تمیز پیدا کرنے والی ایک چیز مقرّر کرے گا خدا اور تم سے تمہاری برائیوں کو دُور کرے گا، تم کو بخش دے گا [وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ(۸:۲۹)] اور خداوند بڑا افضل و کرم کرنے والا ہے ۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرقان کیا ہے؟ ایسی چیز، ایسی کسوٹی، ایسا معیار جو حق و باطل کے درمیان فرق و تمیز پیدا کر سکے، تو یہ امامؑ کی امامت ہے، اُن لوگوں سے جو خدا سے نہیں ڈرتے تھے اُن سے فرمایا جاتا ہے کہ اگر تم خدا سے ڈرو گے امامت کے معاملے میں اور امامت کو تسلیم کرو گے، امام کو قبول کرو گے تو تب تم کو ایک فرقان مقرر کیا جائے گا، ایک (standard)، ایک کسوٹی، ایک معیار، تو اِس میں یعنی مزید ایمان لانے اور خدا سے ڈرنے کے لئے فرمایا

گیا ہے، اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ لوگ خدا سے نہیں ڈرتے تھے اور اِس خدا سے نہ ڈرنے کی وجہ سے نور پر وہ ایمان نہیں لا سکتے تھے، اور نہیں لاتے تھے، اِس کے لئے اُن کے اُس نقص کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے خدا نے فرمایا کہ تم خدا سے ڈرا کرو، ایک یہ، اور اِس سے اُس آیت کو تقویت ملتی ہے جس میں نور پر ایمان لانے کے لئے ارشاد ہوا ہے۔ ایک اور آیت آپ کو بتاتے ہیں "یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا" اے ایمان والو! "اتَّقُوا اللّٰهَ" خدا سے ڈرا کرو "وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ" اور اُس کے رسول پر جیسا کہ چاہئے ایمان لاؤ "یُؤْتِكُمْ كِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ" تاکہ خدا اپنی رحمت سے تم کو دو حصّے عطا کرے گا، "وَیَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا" اور تمہارے لئے ایک نور مقرر کرے گا (۲۸:۵۷) دیکھیں یہ خطاب کن لوگوں سے ہے؟ مسلمانوں سے ہے، حالانکہ وہ دائرۂ اسلام کے اندر ہیں، حالانکہ وہ قرآن کو مانتے ہیں، رسول کو مانتے ہیں، پھر بھی ایک چیز کی نمایاں طور پر کمی ہے، وہ کیا چیز ہے؟ نور، گویا اُن کے لئے نور مقرّر نہیں ہوا ہے، اِس لئے کہ یہاں سے پتا چلتا ہے کہ وہ خدا سے نہیں ڈر رہے ہیں۔

لہٰذا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا سے ڈرا کریں اور رسولؐ پر جیسا کہ چاہئے ایمان لائیں مطلب یہ کہ کچھ باتوں میں رسولؐ کی اطاعت نہیں ہو رہی ہے، کچھ باتوں میں رسولؐ پر شک ہو رہا ہے، کچھ باتوں کے بارے میں یہ سوچا جا رہا ہے کہ رسولؐ کچھ اپنی غرض کی بات کر رہے ہیں۔ اِس کے خلاف خداوندِ عالم کا حکم یہ آتا ہے کہ اے ایمان! والوں تم خدا سے ڈرا کرو اور رسولؐ پر ایمان لاؤ یعنی اُس کی بات کو مانو، باور کرو تا کہ خدا تم کو اپنی رحمت کے دو حصّے عطا کرے، رحمت کے دو حصّوں کا اشارہ یہ ہے کہ قرآن کا ظاہر اور باطن، جسے تنزیل اور تاویل کہا جاتا ہے یا ظاہر اور باطن کہا جاتا ہے یہ دو حصّے ہو گئے، اور دوسرا اِس کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا اور آخرت، "وَیَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا" اور خدا تمہارے لئے ایک نور مقرّر کرے گا۔ دیکھا آپ نے کہ قرآن کے ظاہر و باطن کی طرح تم کو راستہ ملے گا پھر اُس کے نتیجے میں تم کو خدا نور مقرر کرے گا تا کہ اِس نور سے تم چلو گے، زمانے میں، تواریخ میں اور رُوحانیت میں، تو اِس نور کے بغیر چلنا ممکن نہیں ہے اور اِس کے علاوہ یہ ہے کہ تمہارے گناہوں کو بخش دیا جائے گا، نور کی بدولت اور اللہ غفور رحیم ہے، تو دیکھا کہ یہاں جس شان سے نور کا ذکر آیا ہے وہ رسولؐ کے مرتبے کے بعد ہے اور اسلام میں داخل ہونا کافی نہیں ہے جب تک کہ خدا سے کوئی نہیں ڈرتا اور رسولِ محمّد ﷺ پر کامل و مکمل طور سے ایمان نہیں لاتا، جب تک کہ خدا اُس کو رحمت کے دو حصّے نہیں دیتا، جب تک کہ اِس رحمت کے نتیجے میں اُس کے لئے ایک نور مقرّر نہیں ہوتا، تب تک یہ کہیں نہیں چل سکتا ہے، تو نور چلنے کے لئے ہے اور چلنا جو ہے وہ صراطِ مستقیم پر واقع ہے۔ اِس سے نور کی اہمیت اور اِس ایمان کو درجۂ کمال ملنے کا ذکر ملتا ہے، تو یہ ہے کہ ہم قرآن میں سے جہاں بھی ایمان کی کوئی بات کریں گے، تو اُس میں بھول نہیں جائیں گے کہ خدا اور رسول کے بعد نور پر ایمان لانا مومن کے لئے انتہائی ضروری امر ہے، اور ہمارے بزرگانِ دین نے جس طرح (seven pillers of islam) کا

ذکر کیا ہے اور اُس میں واضح طور پر انہوں نے فرمایا ہے، کہ اسلام اگر سات ستونوں پر قائم ہے، تو اُس میں سب سے اوّلین ستون جو ہے وہ ولایتِ علیؑ ہے، ولایتِ آئمہ ہے، تو ایمان امامؑ کے ذریعے سے مکمل ہو جاتا ہے، اور یہ ایک بہت اچھی مثال ہے جیسا کہ میں نے کہا کہ خدا پر ایمان دُنیا کے بہت سے لوگ لاتے ہیں، ادیانِ عالم کے یہ معنی ہیں کہ جو بھی کوئی دین رکھتا ہے وہ سب سے پہلے خدا پر ایمان لاتا ہے، لیکن آج خدا نے، اُس کے رسولؐ نے اور مسلمانوں نے ایسے لوگوں کے یہود، نصاریٰ، مشرک، مجوسی، آتش پرست، ہندو جیسے یعنی نام رکھے ہوئے ہیں، جو پیغمبر کے بغیر خدا پر ایمان لاتے ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ پیغمبر کے بغیر جو صرف اور صرف خدا پر ایمان لاتے ہیں، جو زمانے کے پیغمبر ہیں، جو پیغمبرِ آخر زمان ہیں اُس کے بغیر جہاں بھی اور جس طرح بھی خدا پر ایمان لایا جاتا ہے، تو وہ اسلام کے بموجب کفر ہے، ورنہ خدا سے کون منکر ہو سکتا ہے، خدا سے کوئی منکر نہیں، اِس سے معلوم ہوا کہ جب تک خدا کا مقرّر کردہ رسول ہے اُس پر ایمان نہ لایا جائے تو ایسے ایمان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اب یہ بات اس سے آگے بھی بڑھتی ہے یہاں پر ختم نہیں ہوتی ہے، بالکل اور صحیح معنوں میں اسی طرح سے رسولؐ نے اور خدا نے جس کو نور قرار دیا ہے اُس نور کو بھی تو ماننا پڑے گا، بہت سی حدیثوں میں، بہت سی آیات میں اِس نور کی تعریف ہے، جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود کو علم کا شہر قرار دیا اور امام کو اُس شہر کا گیٹ قرار دیا۔ اِس طرح دوسری مثال میں آنحضرتؐ نے خود کو حکمت کا گھر قرار دیا اور اِس میں جانے کے لئے جو دروازہ ہے وہ امامؑ ہے۔ اب یہ حدیث اور یہ آیت ایک ہی مطلب رکھتی ہیں، کہ خدا پر ایمان لاؤ، رسولؐ پر ایمان لاؤ اور اُس نور پر ایمان لاؤ جو ہم نے بھیجا ہے، چاہے آپ یعنی نور سے شروع کر کے اُوپر کی طرف جائیں یا خدا پر ایمان لانے سے شروع کر کے پھر رسولؐ اور امام پر ایمان لائیں، بہرحال نور پر ایمان لانا ہی ہوگا، نور پر ایمان لانا اقرار کی صورت میں، یعنی اِس سے امام کی امامت کے لئے اقرار مراد ہے اور پھر اسی اقرار سے ایمان آگے بڑھ جاتا ہے، اور یہی سبب ہے کہ شیعوں نے خدا اور رسولؐ کے بعد مولا علیؑ کا نام شہادت میں، اذان میں اور کئی دُوسری چیزوں میں لیا اور یہ صحیح ہے۔ ایسی بہت سی آیات ہیں [جن میں] رسولؐ کے بعد ولایتِ علیؑ کا ثبوت ملتا ہے، جیسے ایک آیت ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ تمہارا دوست یا مختار خدا ہے اور رسول ہے اور وہ لوگ ہیں جو حالتِ نماز میں اور حالتِ رُکوع میں زکوٰۃ دیا کرتے ہیں (۵۵:۵) تو مفسرین نے اِس آیت کے شانِ نزول جو ہے یہ بیان کی کہ ایک دن مولا علیؑ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک سائل نے سوال کیا مسجدِ نبوی میں، تو کسی نے کچھ نہیں دیا تو سائل آسمان کی طرف منہ کر کے کہنے لگا کہ خدایا تو گواہ رہنا کہ تیری اِس مسجد میں میں نے سوال کیا تھا تو کسی نے کچھ نہیں دیا، تو اتنے میں مولا علیؑ نے جو عبادت میں، رُکوع میں مصروف تھے، اپنے مبارک ہاتھ کو سائل کی طرف بڑھایا اور اشارہ کیا کہ اِس انگھوٹھی کو نکالو اور لے لو تو وہیں سے انگوٹھی لے لی گئی، اور اسی اثناء میں آنحضرتؐ پر مولا علیؑ

کی شان میں آیت نازل ہوئی کہ تم کافروں سے دوستی نہ کیا کرو، تمہارے دوست تو خدا ہے اور رسولؐ ہے اور وہ لوگ ہیں جو حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیا کرتے ہیں، اِس میں "اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ" (۵:۵۵) یعنی اس میں معنی دوستی کے بھی ہیں مختاریت اور سرپرستی کے بھی ہیں، تو بہر حال یعنی خدا ورسول کے بعد امامؑ کی ولایت، اُس کی مختاریت، اُس کی سرپرستی، اُس کی دوستی، ولی کے جتنے بھی معنی ہیں اُن تمام معنوں کے ساتھ علیؑ کی ولایت فرض ہے، اور پھر علیؑ سے ائمہ مراد ہیں، علیؑ ایک مستقل مرتبہ ہے، علیؑ ایک نور ہے اور اُس نور کا یہاں تذکرہ ملتا ہے، تو اب معلوم ہوا کہ کبھی ہم نے نور کے متعلق یہ بات کی تھی کہ قرآن کے اندر جو عظیم آیات ہیں اُن میں سب سے پہلے عظیم آیت جو ہے وہ "اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" اسی کی روشنی میں کرتے کرتے ہمیں نور سے متعلق بہت سے بھیدوں کا، بہت سے اسرار کا پتا چلا اور آج ہم جس آیت پر (discuss) کر رہے ہیں یہ بہت بڑی اہمیت والی آیت ہے۔ اِس لئے کہ اگر اِس آیت کے اندر خدا، رسولؐ کا ذکر نہیں ہوتا تو کوئی سمجھنے والا اِس سے خدا مراد لیتا، رسولؐ مراد لیتا، اسلام مراد لیتا، قرآن مراد لیتا لیکن آیت کچھ اِس وضاحت سے ہے اور اِس شان سے ہے کہ خدا کا ذکر ہے اِس آیت کے اندر الگ، رسولؐ کا ذکر ہے اور جہاں خدا کا ذکر ہے وہ اپنے تمام اوصاف کے ساتھ ہے، اپنے ناموں کے ساتھ ہے، اپنی صفات کے ساتھ، اور کوئی چیز اِس میں باقی نہیں ہے اور جہاں رسولؐ ہے وہ رسالت کے ساتھ ہے، وحی کے ساتھ ہے، آسمانی کتاب کے ساتھ رسولؐ ہے، یہ سب اُس کی چیزیں ہیں، رسالت کی چیزیں ہیں، تو جہاں قرآن میں رسولؐ کا ذکر ہوتا ہے، تو رسولؐ ایک منفرد شخصیت نہیں ہوتی ہے، رسولؐ کہنے کے ساتھ ساتھ رسالت، نبوّت، اور آسمانی کتاب، وحی، ہدایت اور نبی یا رسول کی جو صفات ہیں وہ سب مراد ہو جاتی ہیں اُن تمام صفات کی طرف اشارہ ملتا ہے، پھر اِس آیت کے اندر جہاں خدا کا ذکر ہے، رسولؐ کا ذکر ہے اور تیسرے نمبر پر جس نور کا ذکر ہے، تو وہ نور کیا ہے اور کون ہے؟ امامؑ ہے۔ یہ بات آپ کی اور ہماری نیا انکشاف نہیں ہے، تو یہ بات شروع سے ہے، اور اِس کے حاشیے کو دیکھیں گے تو آپ کو پتا چلے گا، آپ یعنی فراغت میں اِس کے حاشیے کو پڑھنا۔

چنانچہ اب جب بھی ہم یعنی ایمان کے سلسلے میں کسی آیت پر (discuss) کریں گے، اور جہاں ایمان کا ذکر ہو گا تو آپ بھول نہ جانا کہ ایمان کے تین مرتبے ہیں یا کہ ایمان کے تین مراحل ہیں، خدا پر ایمان لانا، رسولؐ پر ایمان لانا، امام پر ایمان لانا، یہی نہیں بلکہ آپ باور کریں گے، کہ ہر بات اگر خدا سے شروع ہو جاتی ہے، تو امام پر آ کر مکمل ہو جاتی ہے۔ جیسے اطاعت کو لیں جو فرمایا جاتا ہے کہ خدا کی اطاعت کرو، رسولؐ کی اطاعت کرو اور اگر یہاں رُک جائیں تو مطلب ادھورا رہے گا، جب تک نہ کہا جائے کہ اولوالامر کی اطاعت کرو۔ جس طرح ہدایت کے موضوع میں جائیں تو بہت سی آیات میں خدا کی ہدایت کا ذکر ہوتا ہے اور بہت سی آیات میں رسولؐ کی ہدایت کا ذکر ہوتا ہے لیکن ایک آیت ایسی بھی آتی ہے جہاں ایک ساتھ رسول کا بھی ذکر ہے اور امام کا بھی ذکر ہے: "اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ" (۱۳:۷) اے

رسول آپ صرف منذر ہیں، ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہوا کرتا ہے۔ یعنی ہدایت کا جو کام ہے وہ تو امام کا ہے، آپ ڈرانے والے ہیں اور جس حد تک ہدایت رسولؐ سے منسوب ہے وہ امام کی نسبت سے ہے کہ امام رسولؐ کے نمائندہ ہیں اور جانشین ہیں، لہٰذا امام جو کچھ بھی کام کریں گے، تو یہ پیغمبر کے نام پر ہوگا اور پیغمبر خدا کے فرستادہ ہیں، لہٰذا پیغمبر جو کچھ بھی کریں گے دین کے معاملے میں تو اُس کا اطلاق یا اُس کی نسبت خدا سے ہوگی، تو اسی طرح خدا کے اوصاف ہیں کہ وہ ہادی ہیں یہ کہ اُس نے پیغمبر کو بھیجا اور پیغمبر ہادی ہیں، اِس لئے کہ اُس نے زندگی میں ہدایت کی اور پھر مستقل ہدایت کے لئے اُس نے اپنا جانشین نامزد کیا، اِس معنی میں پیغمبر ہادی ہیں اور امامؑ ہادی ہیں، اِس لئے کہ ہمیشہ دنیا میں موجود ہیں، اور امامؑ کی جو ہدایت ہوتی ہے وہ تفصیلی ہدایت ہوتی ہے، مستقل ہدایت ہوتی ہے، اِس لئے کہ خدا کا جو مرتبہ ہے وہ بہت بلند و بالا ہونے کی وجہ سے اُس تک رسائی ناممکن ہے۔ رسولؐ کا مرتبہ جو خدا کے بعد ہے اُس تک تمام زمانوں کے لوگوں کی رسائی نہیں ہوتی ہے، لہٰذا امامؑ ہی ہے جو ہمیشہ دُنیا میں موجود ہے اور اِس لئے لوگوں کی امامؑ سے رسائی ہو سکتی ہے اور اگر لوگ رسائی نہیں کرتے ہیں تو یہ اُن کا اپنا قصور ہے۔ جس طرح زمانۂ رسولؐ میں جتنے لوگ اسلام کے باہر رہ گئے، تو اُن کی طرف سے کچھ ذمہ داری خدا، پیغمبر پر نہیں ہے، اسی طرح اگر دُنیا میں لوگ امام کو نہیں پہچانتے ہیں، اُس کی اطاعت نہیں کرتے ہیں تو اِس کی ذمہ داری خود اُن لوگوں پر ہوتی ہے نہ کہ امام پر۔ پھر ایمان کے سلسلے میں آپ سوچنا، کہ ایمان بہت بڑا موضوع ہے اور ایمان کے درجات ہیں اور شروع شروع میں ایمان عقیدے کی شکل میں ہوتا ہے، جس کو آپ (blind faith) کہتے ہیں، یہ بہت اچھی چیز ہے، اِس کا دوسرا مطلب ہے کہ باور کرنا، کیونکہ (literal sense) میں ایمان باور کرنے کو کہا جاتا ہے اور اصطلاحی طور پر یہ باور کچھ اِس طرح سے ہے کہ خدا اور رسول اور امام پر باور کیا جائے اور جو لوگ امام پر باور نہیں کرتے ہیں تو وہ بحقیقت ایمان نہیں لائے۔ لیکن یہ جو لیکچر ہے یا یہ جو نکتہ ہے بہت ہی نازک ہے، ہم اِس کو اِس طرح سے بیان نہیں کر سکتے ہیں، لیکن ہم نے کیا بہر حال، اور یہ ہے آپ اِس سلسلے میں کوئی سوال کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔

سوال: [(شاہدہ محی الدّین) سر! جہاں خداوند تعالیٰ نے "یَآ اَیُّھَا الَّذِینَ اٰمَنُوۤا" کا ذکر فرمایا ہے وہاں سب سے پہلے امام کا ذکر ہے کیونکہ وہ امام امام کے سردار ہیں]۔ جواب: جی ہاں! تو اِن کا کہنا کہ جہاں ایمان والوں کا ذکر ہے، تو اُس میں امیر المومنین کا ذکر سب سے پہلے آتا ہے، تو امامؑ چونکہ نورِ ہدایت ہیں اِس لئے اُن کی ہدایت عملی صورت میں اِس طرح سے ہے کہ زمانۂ رسول میں وہ سب کچھ کر کے دکھایا امام نے جو کچھ کہ ایک مومن کو کرنا چاہئے، تو کس طرح ایمان لانا چاہئے اور ایمان کے سلسلے میں کیا کیا قربانیاں پیش کرنی چاہئیں، یہ سب کچھ امام نے اِس لئے کیا کہ وہ نور تھا، نور کو راستہ بتانا پڑتا ہے۔ کیونکہ امام زندہ نور ہے اور زندہ نور کو انسانوں کی رہنمائی کے لئے وہ سب کچھ کر کے دکھانا چاہئے

(demonstration) دکھانا چاہیئے جو کچھ کہ مومن کے لئے، مومنوں کے لئے چاہیئے، تو وہ اِس معنی میں امیر المومنین ہیں، امیر المومنین کا انگریزی مطلب (commander of the faithful) یعنی مومنوں کا سردار، امیر یہ ایک لفظ ہے امر کرنے والا، امیر بروزنِ فعیل، عامر بروزنِ فاعل، امر کا مالک اور اولوالامر، امیر، عامر، یہ تین الفاظ ایک دوسرے کے قریب ہیں، گوکہ اولوالامر صیغۂ جمع میں ہے، تو جہاں قرآن میں خدا نے مومنین کو مخاطب کیا، تو وہ دو طرح سے ہے، کہیں تو تعریف کے طور پر ہے، کہیں تو یعنی کہ (blame) کرتا ہے، ملامت کرتا ہے، عتاب کرتا ہے۔ جہاں "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ" کے اِس عنوان کے تحت مومنوں کی کوئی تعریف ہے تو سب سے پہلے اس تعریف کا اطلاق امیر المومنین پر ہوتا ہے، کیوں؟ مومنوں کا سردار تو ہے، اور سب سے آگے تو ہے، بادشاہ تو ہے اِس لئے اور جہاں کوئی (blame) کی بات ہو تو وہ (blame) امیر المومنین کو نہیں چھو سکتی ہے۔ آپ وجہ پوچھیں، یہ تو بالکل یعنی ایک واضح (logic) ہے، منطق ہے کہ بعض مثالوں میں مومنوں کی تعریف ہے اور بعض مثالوں میں یعنی مومنوں کی کچھ کمزوریاں بیان کی گئی ہیں، تو بات واضح ہے کہ جہاں تعریف ہے، تو اُس تعریف میں جو اعلیٰ ہے وہ (base) ہے، وہ بنیاد ہے اور جہاں کچھ یعنی گلہ ہے یا کچھ ملامت ہے، تو اُس کا سبب وہ لوگ ہیں جو ایمان میں کمزور ہیں، تو اِس (blame) کا رخ جو ہے اُن کمزوروں کی طرف ہے اور اِس تعریف کا جو رُخ ہے وہ انتہا کی طرف ہے جو اعلیٰ درجے کا ہے، گوکہ بات مجموعی طور پر ہے، (on the whole) ہے لیکن دُنیا کے اندر بھی کوئی کھیل ہو، کوئی کام ہو، کوئی کسی فیملی سے آپ کچھ بات کرتے ہیں یا کسی گروپ سے کوئی بات کرتے ہیں یا کسی دیہات سے یا کسی محکمے سے آپ بات کرتے ہیں، تو اُس میں اچھے بھی ہیں، برے بھی ہیں، اگر آپ سب کو لیتے ہیں، تو کوئی شک نہیں تو آپ سب کو لے سکتے ہیں لیکن اُس میں وجہ کون ہے، اگر تعریف ہے، کچھ لوگ کی آپ تعریف کرتے ہیں، تو اسکی وجہ جو ہے وہ اچھے لوگ ہیں، اور اگر کسی کو آپ یعنی (blame) کرتے ہیں، تو اُس کی وجہ جو ہے وہ کمزور لوگ ہیں، تو آپ یعنی فرداً فرداً بھی کچھ کہہ سکتے ہیں اور مجموعی طور پر بھی ایک حیثیت ہے، اُس حساب سے بھی کہہ سکتے ہیں، مثال کے طور پر کسی یعنی کھیل کے میدان کو لیں، کسی ٹیم کو لیں تو کسی ٹیم کی تعریف ہوتی ہے، تو ہوسکتا ہے کہ سب برابر نہ ہوں، اُس میں کچھ لوگ جو ہیں وہ بہت یعنی نمایاں کردار انجام دیتے ہوں لیکن اُن کے ساتھ دوسرے بھی شامل ہو گئے، اور اِس کے عکس بھی یہی مثال ہے، تو مطلب یہ ہے کہ جن آیات میں خداوندِ عالم نے "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا" کہا ہے تو اُن آیات میں سوائے نیکی کے مرتضیٰ علیؑ کو، سوائے تعریف کے یاد نہیں کیا ہے اور قرآن میں بہت سی ایسی آیات بھی ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے، کہ جہاں لوگوں کو خدا مخاطب کرتا ہے اُس کے (side) میں کچھ دوسرے حضرات بھی نظر آتے ہیں۔

"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ" (۱۱۹:۹) اے ایمان والو! خدا سے

ڈرو اور تم صادقین میں سے ہو جاؤ، آپ دیکھیں "یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا" میں سب لوگ نہیں ہیں، کچھ اِس خطاب سے الگ بھی ہیں وہ صادقین ہیں، اِس خطاب میں صادقین شامل نہیں ہیں، دوسرے سب لوگ شامل ہیں اور جن سے کہا جاتا ہے کہ اے ایمان والوں تم صادقین میں سے ہو جاؤ، تو وہ صادقین جو ہیں ایمان کے درجہ کمال پر ہیں اور وہ آئمہ ہیں، تو اسلام کے اندر نمونے کے لئے بھی کوئی ہونا چاہئے نا! رسولؐ کے ساتھ صحیح معنوں میں پیروی کرنے والا بھی کوئی ہونا چاہئے نا! رسولؐ تو خود بھی ہدایت کرتے تھے، لیکن دوسرے کسی کو کس طرح یعنی رسولؐ کی پیروی کرنی چاہئے اِس کے لئے بھی کوئی ہونا چاہئے، تو اِس کے لئے امامؑ ہے۔ اسلام پر، اعمال پر، اخلاق پر اور ہر چیز پر روشنی ڈالتا ہے، چنانچہ مولا علی نے ایک مومن کو کس طرح زندگی گزارنی چاہئے اور اسے خدا اور رسول کی کس طرح اطاعت کرنی چاہئے، جہاد میں کس طرح حصّہ لینا چاہئے، علم میں کس طرح آگے بڑھنا چاہئے اور دیگر انسانی صفات میں کس بلندی تک پہنچنا چاہیے، کیا کام کرنا چاہیے، یہ سب کچھ کر کے بتایا، اس لئے کہ وہ دوست ہے، یہ اُن کا کام ہے۔

سوال: [(ڈاکٹر رفیق جنّت علی) سر! آپ نے فرمایا کہ خدا اپنی رحمت سے دو حصّوں کو تمہارے لئے مقرّر فرمائے گا، تو سر آپ نے یہ فرمایا کہ رحمت کے دو حصّوں سے مراد قرآن کا ظاہر اور باطن ہے، تو سر! جو لوگ حضور پر حقیقی معنوں میں ایمان نہیں لاتے تو اُن کے لئے سر قرآن کا ظاہر تو ہوتا ہے]۔ جواب: ہاں! ظاہر تو ہوتا ہے لیکن پھر بھی وہ ادھورا ہی ہوتا ہے، کیونکہ ظاہر اور باطن کے آپس میں (link) ہے، تو پھر اس میں، اِس کا باطن ظاہر پر روشنی ڈالتا ہے اور (gist) ہے، تو لہٰذا وہ ادھورا سا ہوتا ہے، ایک دوسرے سے وابستہ ہونے کی وجہ سے، آج اگر ظاہری ہدایت مکمل ہوتی تو بہت سے لوگ کامیاب ہوتے، دینی طور پر یا دنیوی طور پر یا دونوں لحاظ سے، آپ دیکھتے ہیں کہ یعنی کامیابی نہیں ہے۔

یہ ہے کہ اگر کوئی آنکھیں دیتا ہے، یا (kidney) دیتا ہے، یا اور کوئی عضو دیتا ہے، یا (blood) دیتا ہے یا دل دیتا ہے یا کوئی اور چیز، تو اِس میں یہ ہے کہ اِس میں انسان کی انا تھوڑی ہوتی ہے، کہ وہ انا ایک ایسی چیز ہے کہ اُس کو سرجری کے طور پر دوسرے میں منتقل نہیں کی جا سکتی ہے۔ ہاں! منتقل کی جا سکتی ہے علم اور نظریہ اور عقیدے کی مدد سے، باقی وہ جو کسی کی انا ہے وہ تو اسی کی ہے، اچھی ہے انا یا بری ہے، اعمال اسی کے ہیں، تو یہ ایک ایسی چیز کی طرح، یہی چیز غذا سے بھی بنتی ہے، اور دَوا سے بھی یہ چیز منتقل ہو سکتی ہے اور پیوند کاری سے بھی ہوتی ہے، تو اُس بیمار کا اپنا دین ہے، اپنا نظریہ ہے، اُس کے اپنے اعمال ہیں اور اِس (donate) کرنے والے کا اپنا دین ہے، اپنا ایمان ہے اور اپنا نظریہ ہے، تو اِس میں کوئی چیز خلط ملط نہیں ہو سکتی ہے، کہ اُدھر کی چیز اِدھر آئے اور یہاں کی چیز اُدھر جائے اور جو ایمان ہے، جو علم ہے، جو معرفت ہے، جو اعمال ہے وہ تو ایسی چیز ہے کہ وہ اِس مادّی اِختلا ط سے، اِس مادّی آمیزش سے اِس کو کچھ نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ میں نے کہا کہ ہاں! ایمان کو علم، عقیدہ اور اُس کے اُصول کے مطابق تبدیل کیا جا سکتا ہے دوسرے

میں ،رُوح کو منتقل کرنے کے لئے الگ اُصول ہے ،جیسا کہ ہم نے اپنی کتابِ رُوح میں اِس کا ذکر کیا ہے اور رُوح جو ہے (catch) ہونے والی نہیں ہے ۔اب رہا (blood) تو اُس میں روحِ حیوانی ہے اور یہ اعضاء ،تو اِن میں بھی یعنی روحِ حیوانی ہے اور حیوانی حیات ہے ،اُس میں یعنی کہ اصل جو چیز ہے جس کا ایک انسان کی انا سے تعلق ہے وہ چیز منتقل نہیں ہو سکتی ہے ،تو پھر اب اِس میں شک کیا رہا اور اِس میں گڑبڑ کیا ہوئی ،کچھ بھی نہیں ،ہمارے نزدیک یہ سب صحیح ہے اور جائز ہے ،اور اگر وہ لوگ اِس لئے کہتے ہیں کہ ایک آدمی مومن ہے تو اُس کو بہشت میں جانا ہے اپنے عضاء کے ساتھ اور ایک مومن اگر گناہ گار ہے ،تو اُس کے تمام اعضا کے ساتھ جہنم میں جانا ہے ،تو اِس سے یہ خلط ملط نہیں چلے گا ،اگر اُن کا یہ خیال ہے تو یہ بات عبث ہے ،اسلئے کہ بہشت رُوحانی طور پر ہے اور دوزخ بھی رُوحانی طور پر ہے ،اُس کا اِس جسم کے ساتھ کوئی (concern) نہیں ہے ،ہمارا جسم جو ہے ہر سال نو دفعہ گرتا ہے اور نو دفعہ زندہ ہو جاتا ہے ،کیونکہ چالیس دن میں تقریباً یعنی ہمارے جسم کے اندر جو (cells) ہیں وہ گر جاتے ہیں ،فرسودہ ہو جاتے ہیں اور اُن ذرّات یا کہ اُن (cells) کی جگہ پر نئے (cells) بنتے ہیں ،جیسے ایک بیمار آدمی کو ہم دیکھتے ہیں ،کہ بیماری کی وجہ سے اور غذا کے نہ کھانے کی وجہ سے ہفتے کے اندر اندر وہ گل جاتا ہے ،تو مطلب اِس کا یہ ہوا کہ یعنی ہمارے اندر ایک ایسے مکان کی سی صورت ہے کہ اُس مکان کی تجدید ہو رہی ہے ،اینٹیں جو ہیں وہ تبدیل ہو رہی ہیں ،کھڑکیاں تبدیل ہو رہی ہیں ،اور چالیس دن میں ہر چیز جو ہے بالکل بدل جاتی ہے ،اور گو کہ ڈھانچہ وہی ہے ،نقشہ وہی ہے ،گھر کی وسعت وہی ہے پر یعنی جز جز کر کے کوئی کاریگر اِس کو نیا بنا رہا ہے اور یہ جو سلسلہ ہے یعنی چالو ہے ہمارے اندر یعنی ،کہ ہمارے اندر (revealing) ہوتی ہے ،یعنی کہ ہماری تجدید ہوتی ہے ،تو اِس سے معلوم ہوا کہ سال میں یعنی تقریباً نو مرتبہ ہمارا جو جسم ہے پورا ،ہماری جو ہستی ہے یا وجود ہے ،نو مرتبہ ختم ہو جاتا ہے اور نو مرتبہ یعنی ہماری (renewal) ہو جاتی ہے ،تجدید ہو جاتی ہے ۔اِس حساب سے پتا چلا کہ یہ جو جسم ہے یہ کل کو قیامت کے دن ہمارے ساتھ آ کے حساب کتاب میں شرکت کرنے والا نہیں ہے ،تو جو کچھ ہے وہ رُوح ہے ،رُوح میں ہو گا ،لہٰذا اِس جسم کو یہاں جو ہے ،اگر اِس جسم کے کسی حصّے کو کسی کے لئے دیتے ہیں تو اُس میں بھلائی ہے ،اور سائنس کا ایک تقاضا پورا ہوتا ہے ،تو ٹھیک ہے ،اِس میں ہمارے ایمان کو عمل کو کوئی دخل نہیں ہے ،اِس واسطے ہمارے نزدیک یہ بالکل صحیح ہے ۔اُن کو رُکاوٹ اِس لئے ہو رہی ہے کہ وہ اسی جسم کے ساتھ وہاں زندہ ہو جانا چاہتے ہیں ،یہی اُن کا نظریہ ہے ،تو مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے آنکھیں دی ہیں تو وہ نابینا ،اس کا حشر نابینا کے طور پر ہو جائے گا ،یہ بات فضول ہے ۔اگر کوئی رُوحانی طور پر نابینا ہے تو ہزار آنکھ لگائیں تو اُس کو کیا دیکھنے کا ہے ،وہ تو نابینا ہی رہے گا۔

ٹرانسکراب اور ٹائپنگ :نجمہ بیگ　　نظرِ ثانی :اکبر علی　　پرُوف :نسرین اکبر

اُستادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق) کا پُرحکمت بیان

عنوان: قرآن ایک معجزہ

Click here for Audio

کیسٹ نمبر: Q-20　　　　تاریخ: ۲۲؍ جون؍ ۱۹۸۲ء کراچی

اِس نکتے کی کچھ وضاحت کریں گے، کہ قرآن کن معنوں میں معجزۂ الٰہی ہے، کیونکہ گروہِ مسلمین یہ مانتا ہے کہ قرآن معجزہ ہے، ہم کہتے ہیں کہ یقیناً قرآن معجزۂ محمدی ہے اور اِس کے معجزہ ہونے کے سلسلے میں قرآن ہی سے کئی ثبوت فراہم ہو سکتے ہیں۔ اِس سلسلے میں ایک آیت کا مفہوم یہ ہے، کہ جس میں خداوندِ کریم کا ارشاد ہے کہ اگر اِس قرآن جیسی کتاب بنانے کے لئے تمام جنّات اور انسان آپس میں مل بھی جائیں، تو پھر بھی قرآن جیسی کتاب نہیں بنائی جا سکے گی (۸۸:۱۷)۔ یہ قرآن کے معجزہ ہونے سے متعلق ایک (challenge) ہے اور یاد رہے، کہ معجزات کئی قسم کے ہوا کرتے ہیں، اُن میں سے کچھ حسّی ہوتے ہیں، کچھ عقلی ہوتے ہیں، کچھ ہنگامی قسم کے معجزات ہوتے ہیں اور کچھ دائمی معجزات ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کا ایک پہلو حسّی معجزہ ہے جس کا مطلب ہے، کہ کوئی دیکھ سکتا ہے اور سب انسانوں کے سامنے ہے، دوسرا پہلو قرآن کا عقلی معجزہ ہے کہ اِس کا تعلق عقل سے ہے اور عقل ہی اِس کو سمجھ سکتی ہے اور تیسرا پہلو اس کا دائمی معجزہ ہے۔ آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے معجزات کے بارے میں سنا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے معجزات کے بارے میں بھی۔ مگر آج اُن معجزات کا کوئی وُجود نہیں ملتا حالانکہ وہ معجزات خدا کے اُن عظیم پیغمبروں کے برحق تھے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں اُن کی کوئی مثال آج نہیں ملتی ہے؟ جواب ہے کہ وہ معجزات ہنگامی تھے دائمی نہیں تھے۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ کی لاٹھی کا اژدھا بن جانا ایک ہنگامی معجزہ تھا، اور اِسی طرح حضرت عیسیٰؑ کا مُردوں کو زندہ کر دینا یا بیماروں کا رُوحانی معالجہ کرنا یعنی دُعا سے اُن کو فوراً ہی اچھا کر دینا بھی ہنگامی معجزہ تھا، تو ایسے کئی معجزات تھے جن کا تعلق اُن عظیم پیغمبروں کی شخصیت سے تھا یعنی وہ معجزات اُن حضراتِ انبیاءؑ سے وابستہ تھے، جب وہ انبیاءؑ دُنیا سے رُحلت کر گئے، تو اِسی کے ساتھ ساتھ وہ معجزات بھی نہ رہے۔ لیکن اِس مثال کے برعکس جہاں قرآن ایک عظیم معجزہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ کا تو یہ دائمی معجزہ ہے اِس لئے آج دُنیا میں قرآن کا معجزہ موجود ہے۔

یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ ہم قرآن کو کیونکر معجزہ کہہ سکتے ہیں یا مان سکتے ہیں؟ تو سنئے کہ لفظِ معجزہ ایک عربی لفظ ہے جو عجز کی (root) سے ہے یعنی اِس کا مادّہ عجز ہے، ع۔ج۔ز، اور عجز کسی کام کے کرنے سے عاجز ہونے کا نام

ہے اور اصطلاحاً معجزہ اُس کام کو کہتے ہیں جس کو سوائے ایک ہستی کے کوئی نہیں کرسکتا ہے، تو یہ معجزہ کی (definition) ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے، کہ معجزے کیسے کیسے ہیں؟ تو جیسا کہ کچھ معجزے کی قسموں کی وضاحت کی گئی، اِس طرح اور بھی معجزات کی قسمیں ہیں، مثلاً ظاہری معجزات اور باطنی معجزات وغیرہ۔ اب لفظِ معجزہ کی اتنی سی وضاحت کے بعد ہم لوٹتے ہیں معجزۂ قرآن کی طرف کہ آنحضرتؐ پر جیسی آسمانی کتاب نازل ہوئی تھی ایسی جامعیّت والی کتاب کبھی نازل نہیں ہوئی تھی، اور یہ اِس لئے کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سردارِ انبیاء و رسول ہیں اِسی طرح جو کتاب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی وہ بھی تمام سابقہ آسمانی کتابوں کی جامع تھی۔ اِس کے علاوہ ایک اور وجہ یہ بھی ہے جو بہت ہی معقول ہے، کہ احادیثِ نبوی سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ قرآن کی تنزیل آنحضرتؐ کا معجزہ ہے اور اُس کی تاویل آپ کے وصی، آپ کے جانشین یعنی امامِ برحق کا معجزہ ہے، لہٰذا سرورِ اکرمؐ کے زمانے سے امام کا ظہور ہونے والا تھا۔ پس قرآن ایسا نازل ہوا یعنی حضورؐ کی کتاب ایسی نازل ہوئی کہ وہ تنزیل کے لحاظ سے بھی اور تاویل کے لحاظ سے بھی ایک بےنظیر معجزے کی حیثیت سے تھی۔

چنانچہ ہمیں حقیقی اسماعیلیوں کی حیثیت سے یہ جاننا ازحد ضروری ہے، کہ تاویل کا معجزہ امام کس طرح کرتے ہیں۔ جیسا کہ ابھی بتایا گیا تھا کہ معجزہ وہ ہے جسے کوئی ایک ہستی انجام دے سکتی ہے، اور اُس کے سوا دُنیا کا کوئی فردِ بشر اُس کو نہیں کرسکتا اور تاویل کے معاملے میں یہی حقیقت ہے، کہ قرآن کی تاویل جو امامؑ کا معجزہ ہے، امامؑ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا ہے۔ اِس موضوع سے اِس حقیقت کا پتا چلتا ہے، کہ تاویل کی طرف توجّہ دینا اسماعیلیوں کے لئے ازبس ضروری ہے کیونکہ تاویل اِنکے برحق امام کا معجزہ ہے اور یہ ایک ایسا معجزہ ہے جو دُنیا کے ہوشمند لوگ اِس کو دیکھ سکتے ہیں۔ وہ اِس طرح کہ اگر آپ کے پاس قرآن کا ایسا علم ہو، کہ اُس کے بیان کرنے سے لوگ حیرت میں پڑتے ہوں، تعجّب کرتے ہوں اور جو حکمتیں آپ بیان کرتے ہیں ایسی حکمتیں کوئی بیان نہیں کرسکتا ہے، تو اِس کی تعریف امام کو جائے گی اور لوگوں میں سے جو ہوشمند ہیں وہ البتہ باور کریں گے، کہ اگر اسماعیلیت میں قرآنِ مقدّس کا ایسا زبردست علم پایا جاتا ہے، تو وہ یقیناً امام کے سوا اور کہیں سے نہیں مل سکتا ہے۔

اِسی طرح ممکن ہے کہ ہم امامؑ کے اِس دائمی معجزے کو جو تاویل اور حکمت کے رنگ میں ہے، لوگوں پر ظاہر کریں اور اگر ہم لوگوں پر ظاہر نہ بھی کریں تو اپنے طور پر یقینِ کامل حاصل کرنے کے لئے بھی ضروری ہے، کہ ہم قرآن کی حکمتوں کو قرآن کی تاویلات کو رفتہ رفتہ سمجھ لیں اور ہم یہ کام کئی وسائل سے کرسکتے ہیں۔ اُن میں سے ایک وسیلہ بزرگانِ دین کی کتابیں ہیں جن میں قرآن کی تاویلات بکھری ہوئی ہیں، تو ہم اُن قرآن کی تاویلات اور حکمتوں کو حاصل کرکے اپنے طور پر اطمینانِ قلب حاصل کرسکتے ہیں، کہ لوگ جس طرح قرآن کا دعویٰ کرتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پاک ارشاد میں فرمایا تھا کہ: "اَلْقُرْاٰنُ مَعَ عَلِيٍّ وَ عَلِيٌّ مَعَ الْقُرْاٰنِ" یعنی قرآن علیؑ کے ساتھ ہے اور علیؑ قرآن

کے ساتھ۔ اِس کا مطلب یہ نہیں کہ علیؑ جہاں بھی جاتے تھے قرآن اُن کے ساتھ ساتھ ماڈی اور جسمانی طور پر جاتا تھا یا علیؑ اُسے ہمیشہ اُٹھا کے لے جاتا تھا یا قرآن جہاں ہو وہاں علیؑ بھی ماڈی طور پر جاتا تھا۔ بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی دو حیثیتیں ہیں، ایک یہ کہ وہ ایک رُوح ہے اور ایک نور ہے، دُوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے۔ جہاں قرآن ایک رُوح ہے اور ایک نور ہے، تو چونکہ رُوح اور نور ایک کامل انسان کے اندر رہوتا ہے اور رُوح کسی بھی بے جان چیز میں نہیں پائی جاتی، تو یقیناً قرآن کی رُوح اور قرآن کا نور یہ دوسرا لفظ ہے مولا علیؑ میں ہے اور مولا علیؑ سارے اماموں کا ٹائٹل ہیں لہٰذا علیؑ سے ہر زمانے کا امام مراد ہے، اِس (logic) سے حدیث کے معنی منتقل ہو جاتے ہیں یعنی علیؑ کی شان میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اُس کا اطلاق ہر زمانے کے امام پر ہوتا ہے۔ چنانچہ آج امامِ زمانؑ کے ساتھ قرآن ہے اور قرآن کے ساتھ امامؑ ہے، اِسی لئے امام صاحبِ تاویل ہوا کرتا ہے جس طرح کہ پیغمبر صاحبِ تنزیل ہوا کرتا ہے، نہ بھولیئے گا کہ تنزیل کا مطلب قرآن کا ظاہر ہے اور تاویل سے قرآن کا باطن مراد ہے، جسے دُوسرے لفظوں میں تاویل یا حکمت بھی کہا جاتا ہے۔ یاد رکھئے گا، کہ قرآن کس طرح نازل ہوا تھا کس رنگ میں نازل ہوا تھا کس صورت میں نازل ہوا تھا، یہ قرآن سے متعلق جو بنیادی بات یہ ہے کہ ہم قرآن کی (original) حیثیت کو ہم سمجھیں۔ کیونکہ کسی بھی چیز کے (original) کو یا اصل کو یا اصلیت کو، حقیقت کو، بنیاد کو اور جڑ کو جاننا یہ دانشمندوں کا کام ہے۔ چنانچہ قرآن ایک رُوح کی حیثیت سے سرورِ عالم کے قلبِ منور پر نازل ہوا تھا، اور جو چیز دل پر نازل ہوتی ہے وہ ماڈی نہیں ہوتی ہے بلکہ رُوحانی ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ دل کے اندر خارجی، ماڈی چیزوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے مگر بے شک رُوحانی چیزوں کے لئے دل میں ایک وسیع دنیا موجود ہے۔ آپ قرآن میں جا کر دیکھیں گے تو معلوم ہوگا، کہ قرآن حضورِ انورؐ کے پاک دل پر نازل ہوا تھا (۲:۹۷)۔ یہ درست نہیں جو بعض روایتوں کی بنیاد پر بتایا جاتا ہے، کہ قرآن ظاہری اور ماڈی تحریروں کی صورت میں نازل ہوتا تھا، اِس کی تصدیق قرآن کی کسی بھی آیت سے نہیں ہو سکتی ہے۔

آپ خانۂ حکمت کی کتابوں کو پڑھیں گے، تو معلوم ہو جائے گا کہ قرآن اصل میں ایک رُوح کی حیثیت میں نازل ہوا ہے یعنی ایک زندہ رُوح، جب آنحضرتؐ عبادت و بندگی میں درجۂ انتہا کو پہنچے، تو خداوندِ عالم نے نورانیت کی ایک دُنیا کی حیثیت سے قرآن کی رُوح اور رُوحانیت کو آنحضرتؐ پر نازل فرمایا۔ حضورِ اکرمؐ نے اُن ہی رُوحانی احوال کی ترجمانی کرتے ہوئے قرآن عربی زبان میں لکھایا، مگر رُوح اور رُوحانیت کو کاغذ پر کس طرح منتقل کیا جا سکتا تھا، آپ اپنی کسی تحریر میں یا کسی مضمون میں یا کسی کتاب میں فرشتے کے بارے میں کچھ لکھ سکتے ہیں، لیکن فرشتے کو کاغذ کے اوپر نہیں دکھا سکتے ہیں، رُوح کے بارے میں کچھ کہہ سکتے ہیں لیکن رُوح کی شکل وصورت کو، رُوح کی حقیقتوں کو جس طرح کہ وہ ہے قلم کے زور سے اُس کو نہیں دکھا سکتے ہیں۔ آپ سورج کے بارے میں کچھ لکھ سکتے ہیں لیکن سورج کو کتاب میں یا کاغذ میں بند نہیں کر سکتے

ہیں۔ اِس سے کم تر مثال یہ ہے، کہ آپ کسی بھی اخلاقی یا مذہبی قلم کی کوئی بات لکھ سکتے ہیں لیکن قلم کو آپ کاغذ میں یا خط میں قید کر سکتے ہیں۔ پھر قرآن کی رُوح اور رُوحانیت [کو] کس طرح قرآن میں بند کیا جا سکتا تھا، قرآن کی رُوح و رُوحانیت آنحضرتؐ کے ساتھ رہی مگر اُس کا ایک (interpretation)، ایک ترجمہ یا ترجمانی قرآن کی موجودہ تحریر میں لائی گئی۔ ہاں! یہ بات صحیح ہے کہ ایک شخصیت سے دوسری شخصیت میں زندہ رُوح اور رُوحانیت منتقل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ پیغمبرؐ کی ذات سے، محبتوں کے رستے سے، شفقتوں کے رستے سے، علم کے رستے سے اور توجّہ کے رستے سے، اسمِ اعظم کے رستے سے قرآن کی رُوح اور رُوحانیت علیؑ میں منتقل ہوگئی۔ علیؑ میں قرآن کی رُوح اور رُوحانیت کی منتقلی سے کیا تعجّب ہو سکتا ہے۔ آپ کو بھی یہ سعادت مل سکتی ہے، کسی اور مومن کو بھی یہ سعادت مل سکتی ہے اور اگر دُنیا بھر کے لوگ امامؑ سے رُجوع کریں، امام کی فرمانبرداری کریں جیسا کہ فرمانبرداری کا حق ہے، تو قرآن کی رُوح سب کو ملے گی، بغیر اِس کے کہ اُس سے کوئی ذرّہ کم ہو۔ چونکہ یہ رُوح اور رُوحانیت کی بات ہے اُس میں کمی بیشی نہیں ہوتی ہے، جس طرح کہ اگر سورج کے سامنے دس آئینے رکھیں، تو اُن دس کے دس آئینوں میں سورج نظر آئے گا۔ دس کیا ہیں؟، ہزار ہوں، لاکھ ہوں، کروڑ ہوں اور اتنے ہوں جتنے کہ دنیا کے لوگ تو ہر آئینے میں سورج نظر آئے گا، بغیر اِس کے کہ سورج میں کوئی کمی واقع ہو۔ اِسی طرح رُوحِ قرآن یا کہ نورِ قرآن ایک ہمہ رَس حقیقت ہے اِس لئے تابعداری کی شرط پر سب کو یہ نور مل سکتا ہے، تو پھر ہم کیوں تعجّب کریں کہ قرآن کی رُوح اور رُوحانیت پیغمبرؐ سے علیؑ میں اور علیؑ سے اولادِ علیؑ کے ائمہؑ میں منتقل ہوتی رہی، اِس میں کوئی تعجّب نہیں ہے۔ زمانۂ ماضی کے ہمارے جن پیروں اور بزرگوں نے رُوحانی علم کے کمالات دکھائے، اُن کو اِسی طرح قرآن کی رُوح اور رُوحانیت امام سے مل رہی تھی، تو اِن ہی معنوں میں امام صاحبِ تاویل ہیں اور امام کا یہ علمی معجزہ سب سے زیادہ پائیدار بھی ہے اور مفید بھی ہے اور ہمہ رَس بھی۔

یہاں پر ایک اور نکتہ بتائیں گے دیکھیں کہ بعض دفعہ لوگوں کے دل میں جو غیر ہیں یا بعض کمزور اسماعیلیوں کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے، کہ امام اگر برحق امام ہیں تو معجزات کیوں نہیں کرتے ہیں؟ حالانکہ وہ معجزہ جو کرنا چاہئے جس میں سب کے لئے فائدہ ہی فائدہ ہے وہ تو کرتا رہتا ہے، وہ تو سورج کی طرح تابان و درخشان ہے۔ اِس کے یہ معنی ہوئے کہ امام سے علمی معجزہ چاہنا چاہئے جس میں رُوح کی آبادی ہے، جس میں ایمان کی سلامتی ہے، جس کا نتیجہ ایمان اور یقین ہو سکتا ہے، اور اِس کے علاوہ مومن کو کوئی ایسا معجزہ طلب نہیں کرنا چاہئے جس کے نتیجے میں ناشکری ہو اور ناقدری ہو یا مومن جس کے نتیجے میں شک میں پڑ جائے۔ کیونکہ بعض معجزات ایسے ہیں کہ جن کے بعد یا تو ناشکری لوگوں کو برباد کر دیتی ہے یا وہ سمجھتے ہیں، کہ یہ معجزہ نہیں تھا جادو وغیرہ تھا، جیسے اِس سلسلے میں آپ قرآن کے قصوں میں جائیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ حضراتِ انبیاءؑ ہنگامی معجزات یا حسّی معجزات کیا کرتے تھے۔ لیکن اُن معجزات کے نتیجے میں کچھ خاص فائدہ نہیں ہوا بلکہ وہ

معجزات اہلِ انکار کے لئے باعث ہلاکت ثابت ہوئے ۔ جیسے موسیٰ ؑ نے فرعون اور اُس کی قوم کے سامنے بہت سارے معجزات کئے تھے، لیکن جواب کیا ملا؟ یہ کہا گیا کہ یہ جادو سیکھ کے آیا ہے، جادو گر ہے ۔لہٰذا ملک بھر سے جادوگروں کو اکٹھے کئے جائیں تاکہ اِن کے ساتھ مقابلہ کیا جائے اور اِن کو شکست دی جائے اور ایسا ہی کیا گیا لیکن موسیٰ ؑ کا معجزہ، معجزہ ہی تھا جادو نہیں تھا۔لہٰذا سب جادوگر شکست کھا گئے اور تابعداری کے سجدے میں گر پڑے اور اُنہوں نے کہا کہ موسیٰ ؑ کا پروردگار برحق اور موسیٰ ؑ برحق نبی ہے رسول ہے ۔ پھر اس پر فرعون نے کیا کہا۔کہا کہ اوہو! یہ تو تمہارا اُستاد ہے تم نے آپس میں سازباز کیا ہے میں تم کو پھانسی پہ چڑھاؤں گا (۲۶:۴۱-۴۹) ۔اِس مثال میں آپ نے دیکھا کہ جوحسّی وغیرہ قسم کے معجزات ہوتے ہیں اُن کا کیا نتیجہ ہوتا ہے ۔لہٰذا ہوشمند مومن وہی ہے جو اپنے برحق امام سے علم و ہدایت کے معجزے کو چاہے، جس میں ایمان کی سلامتی ہے، جس میں یقین اور معرفت کے اضافے کا ذریعہ ہے ۔لہٰذا صاحبِ تاویل کو، صاحبِ تاویل مانتے ہوئے باطنی تاویل اور حکمتِ قرآن کے لئے جدو جہد کی جائے یہ اسماعیلیوں کا شیوہ ہے اور امام کا علمی معجزہ بہت ہی زبردست ہے اُس کی طرف توجہ دی جائے، قرآن کو سمجھ لیا جائے ۔کیونکہ تاویل اور حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم تاویل اور حکمت کی سطح کو پہنچیں یعنی کچھ عربی زبان کو، کچھ قرآن کے ظاہر کو سمجھیں یعنی ہم قرآن کے ظاہر کو اور قرآن کی زبان کو، عربی کو سمجھیں ۔تاکہ ہم اِس کے بعد قرآن کے باطن کو یعنی حکمت کو سمجھ سکیں اور پھر ایک وقت ایسا آئے گا جس میں کہ ہمیں قرآن کی حکمتوں سے بیحد خوشی ہوگی، اور ایک مومن کو کیسے خوشی نہیں ہوگی جبکہ وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ ملتا ہے وہ امام کی طرف سے ملتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے، کہ قرآن کی تاویل کا مالک امام ہے اور اگر مومن بلواسطہ یا بلاواسطہ یعنی (directly) یا (indirectly) قرآن کی حکمتوں کو سمجھتا ہے یعنی کسی اُستاد کے ذریعے سے یا اُستاد کے بغیر تو ہر حالت میں اُس کو خوش ہونا چاہئے کہ وہ اِسی طرح ذرّہ ذرّہ کرتے ہوئے قرآن کی رُوح کو پا رہا ہے جو رُوح القدس ہے جو نور ہے، جو نور کے ذرّات ہیں ۔نور کے اِن ذرّات کو جمع کرتے کرتے ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ نور کا ایک طوفان اُٹھے گا اور پھر نور کا ایک سمندر دل کے اندر موجزن ہونے لگے گا، اور پھر اِسی سے رُوحانی انقلاب یا رُوحانی ترقّی ہوسکتی ہے ۔اِس کے لئے کتنی بڑی سعادت ہے آپ کی کہ آپ ایسی کتابیں پڑھ رہے ہیں جن کے اندر قرآن کی حکمت سمو دی گئی ہے اور اِس کے علاوہ آپس میں مذاکرے کرتے ہیں، علم کی باتیں ایسی سنتے ہیں کہ وہ گوہرِ گرانمایہ ہیں، بہت ہی قیمتی موتی ہیں ۔مومن کے لئے اور کیا چاہئے، یہی علم تو نور ہے جس کی بدولت باطن کی تاریکی بتدریج دُور ہوسکتی ہے اور دل و دماغ اِس سے منور ہوسکتا ہے، تو آج اِس گفتگو میں یا اِس کلاس میں جو باتیں آپ کے سامنے لائی گئیں ہیں، یہ میرے نزدیک بہت ہی اہم ہیں، اِن کو ذہن نشین کرلیا جائے اور غور و فکر سے کام لے کر اِن نکات کو یا اِن حکمتوں کو ہضم کرلیا جائے ۔کتنی اچھی بات ہے کہ آپ کا سیکھ لینا بہت ہی فائدہ بخش ہے، ایک یہ کہ آپ کے اپنے لئے اور ایک یہ کہ آپ دُوسروں کو علم دے سکتے ہیں ۔

میں نے کبھی کہا تھا کہ ایک مثال میں پہاڑی بکری بہت اچھا جانور ہے، وہ پھولوں پر چرتی ہے، پہاڑ کی چراگاہوں میں موسمِ گرما میں بہت سارے پھول کھل جاتے ہیں، تو اُس کی عادت یہ ہے کہ جب گھاس کی فروانی ہوتی ہے تو بجائے اِس کے کہ وہ گھاس کھائے وہ قدرتی طور پر پھولوں پر چرتی ہے اور اُس کا دودھ جو بنتا ہے اُن پھولوں کی غذائیت سے بھرپور ہو جاتا ہے، اور اُس دودھ کے اندر طرح طرح کی وٹامنز، حیاتین ہوتی ہیں اور اُس کا بچہ اُس دودھ کو پیتا ہے۔ یہ مثال امام کو جاتی ہے، کہ امام ہم کو جو رُوحانی دودھ پلاتا ہے، رُوحانی ماں کی حیثیت سے جو علم کا دودھ ہے، جو ہدایت کا دودھ ہے، تو وہ علم کی غذائیت سے بھرپور ہے، اور اُس سے ہماری رُوح کی مکمل نشوونمائی ہونی چاہئے، اور ہمیں سمجھنا چاہئے کہ جو چیز ہم کو ملتی ہے دُنیا میں کسی کو نہیں ملتی، یہی تو امتیاز ہے اور یہی امام کی خصوصیت اور امام کو معجزہ ہے۔ اگر اِس سعادت کو جانتے ہوئے ہم سستی کریں، تو پھر ہماری طرف سے یہ بہت بڑی ناشکری ہو گی کہ ہم نے سمجھتے ہوئے نہیں سمجھا اور جانتے ہوئے نہیں جانا۔ کسی شخص کا کسی چیز کو نہ جاننا اور نہ سمجھنا الگ بات ہے، اور جانتے ہوئے اور سمجھتے ہوئے کسی اہم چیز کو نظر انداز کر دینا، یہ بہت بڑی بات ہے۔ اِس کے لئے میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں، کہ آپ یہ اپنا شیوہ بنا لیں کہ ہر وقت کچھ نہ کچھ قرآنی علم کو حاصل کرتے رہیں تا کہ رفتہ رفتہ قرآن کی رُوح، آپ کے اندر زندہ ہو جائے، جب اُس کی (quantity) مکمل ہو جائے گی، تو وہ خود بخود زندہ ہو جائے گا۔ موسیٰ ؑ نے ایک دن پروردگارِ عالم سے عرض کی اور پوچھا کہ خداوندِ عالمین! اِس زمانے میں کوئی زیادہ جاننے والا ہے کہ آپ نے اپنے رحمت و مہربانی سے مجھے پیغمبر بنایا ہے زمانے میں اور دُنیا میں، لیکن اِس کے باوجود اِس دنیا میں کوئی ہستی ایسی ہے، کہ میں اُس سے علم کو حاصل کروں؟ تو خداوندِ عالم نے ارشاد فرمایا کہ دیکھو موسیٰ ایک جگہ ہے وہاں پر دو دریا آپس میں ملتے ہیں یا اُن کا سنگم ہے، وہاں پر میرا ایک بندۂ خاص ہے اُس سے جا ملنا تو پتا چلے گا کہ علم کیا ہے (۱۸: ۶۰ ـ ۶۵)۔ قصّہ تو بہت ہی لمبا ہے میں اُس سارے قصے کو بیان کرنا نہیں چاہتا ہوں اُس کے لئے وقت نہیں ہے، لیکن اِس میں سے ایک مثال میں چاہتا ہوں، وہ یہ کہ موسیٰ کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ وہ دو دریا آپس میں کہاں ملتے ہیں، ایسی مثالیں چند ہوں گی لیکن اصل جگہ کو معلوم کرنے کے لئے ایسا کرنا کہ ایک مچھلی کو جلا کے اُس کی راکھ کو رومال میں باندھ لینا، جہاں لگے کہ دو دریا آپس میں مل رہے ہیں اور یہ وہی مقام ہے جس کے متعلق خداوند کا ارشاد ہے تو اُس وقت تھوڑی سی راکھ اُس دریا کے اندر ڈالنا۔ اگر تم دیکھتے ہو کہ وہ جلی ہوئی راکھ زندہ مچھلی کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے یعنی جلی ہوئی مچھلی زندہ ہو جاتی ہے، تو سمجھ لینا کہ وہ وہی مقام ہے جہاں پر کہ میرا ایک بندۂ خاص ملے گا، تو موسیٰ ؑ کے ساتھ ایک جوان تھا یعنی ایک شاگرد تو یہ دونوں چلے گئے اور اتفاق سے اُس مقام کو پہنچے لیکن اُن کو پتا نہیں چلا کہ وہ وہی مقام ہے جہاں پر ٹھہرنا چاہئے، تو موسیٰ ؑ تھکے ہوئے تھے تو وہ ذرا سو گئے اور اُن کے شاگرد کچھ ہاتھ دھونے کے لئے سمندر کے کنارے پر گئے اور ہاتھ دھو کے وہ واپس آئے جس رومال میں مچھلی کی راکھ

بندھی ہوئی تھی، تو جیسے ہی اُس نے رومال کو ہاتھ لگایا تو پانی کا ایک بوند اُس رومال کے اندر جو رکھی تھی اُس پر ٹپک پڑا اور جیسے ہی بوند ٹپک پڑا تو وہیں سے مچھلی زندہ ہو کر دریا میں چلی گئی، تو موسیٰؑ کے شاگرد نے خاطر میں یہ بات لائی کہ جیسے ہی اُستاد جاگیں گے تو اُن کو یہ بات بتادی جائے گی لیکن اتفاق سے جب وہ جاگے تو یہ بھول گئے اور وہ وہاں سے بہت آگے چلے گئے۔ آگے چلنے کے بعد ایک مقام پر ٹھہر کے اُن کے ساتھ جو غذا تھی جو کھانا تھا اُس کے کھانے کا تقاضا ہوا یعنی اُن کو بھوک لگی اور تھک گئے، تو کھانا کھاتے کھاتے پھر موسیٰؑ کے شاگرد کو وہ بات یاد آگئی اور کہا کہ کس طرح مچھلی زندہ ہو کر دریا میں چلی گئی (۱۸: ۶۰۔ ۶۵)۔

اِس مقام پر بھی کوئی تاویل ہے اور تاویل کے بغیر یہ بات دنیاوی طور پر ممکن نہیں ہے، اور دُنیا میں کوئی ایسا پانی نہیں ہے، کہ اُس میں جلی ہوئی مچھلی کی راکھ زندہ ہو کر مچھلی بن جاتی ہو۔ کوئی مقام ایسا نہیں ہے مگر یہ رُوحانیت کی سعادتوں کی طرف اشارہ ہے، تو حقیقی علم ہی وہ پانی ہے جس میں کہ ہماری مری ہوئی رُوح زندہ ہو سکتی ہے، رُوح کا مرجانا کس معنیٰ میں ہے؟ اِس لئے کہ زندگی کی مختلف سطحیں ہیں، جمادات کو دیکھیں تو درخت زندہ ہے یعنی بہتر ہے، درختوں کو دیکھیں تو جانور زندہ ہیں، جانور کو دیکھیں تو انسان اُس سے بہتر زندگی میں زندہ ہے اور پھر اِسی طرح انسانوں کے مختلف طبقات بنتے ہیں۔ اگر کوئی شخص حیوانی زندگی میں زندہ ہے، تو وہ کیا زندگی ہے، کھانا، پینا، سونا، جاگنا، چلنا، پھرنا، حرکت کرنا یہ زندگی تھوڑی ہے، یہ زندگی حیوان بھی رکھتا ہے۔ کوئی حقیقی رُوح ہوگی وہ ملے تو صحیح زندگی کہلائے گی اور ہاں! ایسی رُوح حقیقی علم کی رُوح ہے۔ جس علم کے دودھ کا میں نے ذکر کیا اگر وہ دودھ ایک وقت تک ملتا رہا، تو بے شک ہم صحیح معنوں میں زندہ ہو جائیں گے۔ ہمیں دوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ اُمید ہے اِس لئے کہ ہم امامؑ کے رُوحانی فرزند ہیں اور قرآن ہمارے رُوحانی باپ کی میراث ہے، اگر ہم اِس رُوحانی میراث سے غفلت برتتے ہیں، تو یہ ہماری غفلت ہے یا کسی نے ہم کو غلط سمجھایا ہے، غلط تاثر دیا ہے۔ ہم اُس میدان سے کیوں ہٹ رہے ہیں جس میں کہ امام معجزے کر کر کے بتا سکتا ہے، دکھا سکتا ہے اور امامؑ کے جنرل معجزات قرآن کے میدان میں ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ ہمارا مذہب کیسا ہے، ہم دیکھیں گے کہ ہمارا امام کیسا ہے، جب دُوسرے لوگ بات کرتے ہیں ہمارے خلاف تو اُس وقت ہمارے دل میں نیزے جیسے لگتے ہیں، ٹھیک ہے اگر غیرتِ دین سے ایسا ہوتا ہے تو صحیح ہے، اگر کمزوری سے ہم کو دکھ پہنچتا ہے، تو یہ بات اچھی نہیں ہے۔ یعنی دوسروں کی مخالفانہ باتوں سے ہمیں دو قسم کا اثر ملے گا، ایک یہ کہ غیرتِ دین یا حمیّتِ دین کے طور پر ہم کو دُکھ پہنچے گا اور جس میں ہمیں مخالفین کے خلاف غصّہ آئے گا اور ہمیں اُن سے نفرت پیدا ہوگی، ہم سمجھیں گے کہ وہ غلط کہہ رہے ہیں یہ غیرتِ دین کا ثبوت ہے۔ اِس کے برعکس اگر ہم میں کمزوری ہے تو ہم شک میں پڑیں گے کہنے لگیں گے سوچنے لگیں گے کہ ہوسکتا ہے، کہ اِن کی بات صحیح ہو چونکہ امام ایک بشر لگتا ہے اور اُس نے ہمارے سامنے کچھ ایسا لیکچر نہیں

دیا جس سے کہ ہم سمجھیں کہ وہ قرآن کا علم سر بسر جانتا ہے، عربی کی خوب مہارت ہے وغیرہ وغیرہ۔ آج جو کمزور اسماعیلی ہیں یا جو چلے گئے ہیں ایسے شکوک میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ کیوں؟ اُنہوں نے امام کو نہیں سمجھا، قرآن کو نہیں سمجھا، وہ سمجھتے ہوتے تو یہ نوبت نہ آتی، یہ بیماری اُن کو نہیں لگتی، پھر اِس سے وہ ہلاک نہیں ہو جاتے، اِس کو ہلاکت کہتے ہیں۔ مجھے کہنے دیجئے کہ ہلاکت یعنی موت کئی طرح سے ہے، ایک موت جسمانی ہے کہ اُس وقت جسم حرکت نہیں کر سکتا ہے جب جسمانی موت واقع ہو جاتی ہے تو جسم بے حس و حرکت ہو جاتا ہے۔ ایک ہلاکت رُوحانی ہے، وہ کیا ہے؟ مثلاً ایک مومن ہے اُس کے اندر ایک اضافی (additional) رُوح تھی، کیا نام تھا اُس کا؟ روحِ ایمانی یا رُوح الایمان، عقیدہ، محبّت، عشق، تابعداری، خلوص والی رُوح جو اُس میں پیدا ہوئی تھی، اگر بدبختی سے اُس کی یہ رُوح ختم ہو جاتی ہے تو وہ دینی طور پر مر جاتا ہے، اب وہ حرکت نہیں کر سکتا ہے، کون سی حرکت؟ وہی حرکت کہ امامؑ سے عشق رکھیں، وہی حرکت جو امام کو چاہے، وہی حرکت جو ایمان کا مظاہرہ کرے وغیرہ، اب اُس کی جو رُوح تھی وہ مر گئی۔

آپ کو بتایا گیا ہے کہ شیطان کا ایک لقب رجیم ہے (۱۵:۱۷) اور رجیم عربی میں پتھراؤ کرنے والے کو کہتے ہیں، (stoning) پتھر مارنے والے کو کہا جاتا ہے، اور اِس کی تاویل یہ ہے کہ شیطان مسائل، سوالات، شکوک وشبہات سے پتھراؤ کرتا ہے یہ اُس کا کام ہے۔ اگر کسی مُرید کی رُوح بہت کمزور ہے، اُس کے پاس ڈھال نہیں ہے، زِرہ نہیں ہے، جسم ورزشی بدن نہیں ہے، کمزور ہے تو اِس (stoning) میں وہ ہلاک ہو جاتا ہے اور ایسے بہت سے لوگ ہلاک ہو چکے ہیں۔ آپ کو مجاہد بننا ہے، آپ کو علم کے اسلحہ سے لیس ہو جانا ہے، آپ کو ایک علمی لشکر کا جرنیل بن جانا ہے، کرنل بن جانا ہے، کمانڈر اِن چیف بن جانا ہے، تو اِس کے لئے علم کے میدان میں آپ کو بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ نہیں تو ایک مجاہد بنیے اور مجاہد بننے کے لئے اسلحہ کی ضرورت ہے۔ امام کے کارخانے میں اسلحہ کی کیا کمی ہے، اسلحہ لگائیے علم کے، قرآن کے، حکمت کے، منطق کے، (logic) کے، عقل کے، دانش کے۔ کیا ہی شان بنتی ہے ایک مجاہد ہے کہ وہ باوردی ہے اور اُس کے ساتھ طرح طرح کے اسلحہ ہیں وہ ڈرتا نہیں ہے اُس کی ایک شان ہوتی ہے، اِسی طرح جس کے پاس علم ہے وہ کبھی ڈرتا نہیں ہے۔ علم کی سخت ضرورت ہے، قرآنی علم کی سخت ضرورت ہے، حکمت کی سخت ضرورت ہے، تاویل کی سخت ضرورت ہے، تو ایک دن میں ساری تاویل نہیں آسکتی ہے۔ لہٰذا آپ اِس کوشش کو جاری رکھئے گا، اِن شاءاللہ جو وسیلہ آپ کو مہیا کیا گیا ہے وہ آج کسی کو مہیا نہیں ہے، جب آپ جانتے ہیں کہ یہ بات صحیح ہے اِس میں کوئی مبالغہ نہیں تو پھر آپ قدردانی کے ساتھ اِس علم سے خانۂ حکمت سے وابستہ ہو جائیے، آپ مقالوں کو بہت ہی غور سے پڑھیں اور اِن کے پڑھنے کا ایک خاص اُصول اپنائیے اور وہ اُصول یہ ہو کہ کوئی بھی پوائنٹ ہے، تو اُس کو آپ اچھی طرح سے ہضم کریں۔ کیونکہ دوسری دفعہ وہی پوائنٹ آئے گا اور اُسی پوائنٹ سے آپ کے کئی سوالات بھی حل ہو جائیں گے اور کسی محفل میں بھی یہ کام آئے گا اور کسی درس و

تدریس میں بھی یہ کام آئے گا اور کسی اور اُلجھن میں بھی یہ کام آئے گا۔

ایک بات میں کروں گا کہ جب میں پہلی بار کینیڈا گیا تھا، تو میرے ایک بہت عزیز عملدار، عارف کا ایک عملدار ہمیشہ ساتھ ہوتا تھا، ہم جاتے تھے سیمینار میں، مجالس میں اور وہاں کئی کئی اعلانات ہو چکے تھے کہ وہ جو بھی چاہیں سوال کر سکتے ہیں اُن کو گویا کہ (train) کیا گیا تھا، تاثر دیا گیا تھا، اچھے (sense) میں تو سوالات ہوتے تھے اور میں مولا کے کرم سے اور اُس کی رحمت سے جوابات کو اچھی طرح سے اور بہت ہی اعتماد کے ساتھ مہیا کرتا تھا، تو ایک دن میرے دوست عملدار نے پوچھا کہ بابا! آپ پہلے سے اِس سوال کے لئے تیاری کر کے آتے ہیں؟ تو کیا بات ہے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ کو کسی سوال کے جواب میں تامّل ہو اور پھر سوچنے لگیں یا کچھ تاخیر ہو اور کچھ جھجھک ہو تو اِس میں کیا راز ہے؟ میں نے کہا کہ یہ بات میرے لئے خاص نہیں ہے بلکہ ہمیشہ سے اسماعیلی خادمین کو یہ مولا کی رحمت ہوتی رہتی ہے تو مولا خود اپنا کام کرتا ہے، تو بات یہ ہے کہ اُمید و یقین سے علم سے وابستہ ہو جائیں تو مولا اِس میں بہت بہت مدد کر سکتا ہے اور اِس میں اور بھی باتیں ہیں اِس سلسلے میں جو میں کبھی آپ کو بتاؤں گا۔ چونکہ آج مجلس ہے اِس لئے شاید اِس گفتگو کو میں ختم کروں گا اور ختم کرنے کے باوجود اِس گفتگو کے دوران اگر کوئی اُلجھن ہوئی ہو یا کوئی متعلقہ سوال پیدا ہوا ہو تو آپ بیشک پوچھ سکتے ہیں۔

سوال: اِنہوں نے سوال اِس طرح سے کیا کہ اِس گفتگو کے دوران پتا چلا کہ خداوندِ عالم نے رُوحانی معجزے کی صورت میں قرآن کو نازل کیا، اور ایک لحاظ سے دیکھا جائے، تو آنحضرتؐ تنزیل اور تاویل دونوں جانتے تھے، لیکن اِس کے ساتھ ساتھ یہ کس طرح مانا جائے کہ پیغمبر صاحبِ تنزیل ہیں اور مولا علیؑ صاحبِ تاویل؟

جواب: اِس کو کہتے ہیں اعتبارات یعنی ایک اعتبار سے یہ صحیح ہے کہ آنحضرتؐ تاویل بھی تنزیل بھی دونوں جانتے تھے اور آپ کا ہمارا یہ کہنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ قاضی نعمان نے ''اساس التّاویل'' میں اور دوسری کئی کتابوں میں اور ہمارے پیر ناصر خسروقؐ نے بھی اپنی تاویلات کے دوران یہ کہا ہے، صحیح ہے، لیکن ہم اِس معنیٰ میں پیغمبر کو صاحبِ تنزیل اور امام کو صاحبِ تاویل بیان کریں گے، کہ گو کہ آنحضرتؐ دونوں کے مالک تھے لیکن حضورؐ نے اپنی حیاتِ طیّبہ میں صرف تنزیل کو ظاہر کیا اور اُنہوں نے تاویل نہیں کی جانتے ہوئے بھی اور تاویل کے لئے اُنہوں نے اپنے جانشین کو قائم کیا، گویا اُنہوں نے تاویل کا مالک اپنے وصی اور جانشین کو بنایا۔ جیسے ایک روز آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ: ''اِنَّ مِنۡکُمۡ مَنۡ یُقَاتِلُ علیٰ تَأۡوِیۡلِ الۡقُرۡاٰنِ کَمَا قَاتَلۡتُ علیٰ تَنۡزِیۡلِهٖ'' بیشک تم میں وہ شخص بھی ہے جو قرآن کی تاویل پر لڑے گا، جس طرح میں نے تنزیل پر جنگ کی تھی، تو اِس حدیث کے بموجب حضورؐ نے صرف تنزیل کو لیا اور تاویل مولا علیؑ کے سپرد کر دیا، تو آپ جانتے ہیں کہ کوئی بادشاہ کسی کو اپنا جانشین بنالیتا ہے، تو اُس جانشین کے پاس جو چیز ہوتی ہے یا جو منصب ہوتا ہے یا جو ٹائٹل ہوتا ہے وہ بھی اُس سے سابق بادشاہ کو پہنچتا ہے، تو ظاہری طور پر دیکھا جائے اِس

میں کوئی شک نہیں کہ آنحضرتؐ صاحبِ تنزیل اور صاحبِ تاویل دونوں تھے لیکن اِس اعتبار سے کہ اُنہوں نے اپنے وقت میں تاویل کو بروئے کار نہیں لایا، کیوں؟ اِس لئے کہ تنزیل بھرپور شریعت کا نام ہے اور تاویل حقیقت کا نام ہے اور دیکھیں کہ شریعت اور حقیقت بیک وقت عمل میں نہیں لائے جاسکتے ہیں، کیونکہ دونوں کے درمیان فرق ہے اور اگر اُسی وقت حقیقت کو ظاہر کیا جاتا جبکہ شریعت کا زمانہ تھا، تو شریعت باطل ہوجاتی اور شریعت کا کوئی وُجود ہی باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا تئیس (۲۳) سال کی مدّت میں حضورِ اکرمؐ نے ابتداءً شریعت پر زور دیا اور حقیقت کے لئے اُنہوں نے اپنے جانشین کو مقرّر کیا اور حضورؐ کے جانشین نے بھی اپنی زندگی میں ساری تاویل نہیں بتائی۔ چونکہ وہ آئمہ کے ٹائٹل تھے عنوان تھے، لہٰذا اِس علیؑ کے صاحبِ تاویل ہونے سے مراد یہ ہے کہ سب آئمہ صاحبِ تاویل ہیں، یعنی کہنا یوں ہے کہ تاویل ایک لمبے دَور پر پھیلی ہوئی ہے، وہ کسی ایک امام کی زندگی میں ختم ہونے والی نہیں ہے بلکہ وہ پیچھے سے پیچھے زیادہ سے زیادہ زوردار ہونے لگی جبکہ مولانا علیٰ ذکرہ السّلام علیہ السلام کا زمانہ آیا، تو اُس وقت حقیقت کا اعلان فرمایا گیا یعنی وہیں سے حقیقت کا ایک بھرپور زمانہ شروع ہونے لگا، گوکہ یہ زمانہ شروع ہی سے تھا ایک لحاظ سے، تو آپ کا سوال بڑا اچھا تھا اور اِس کا جواب یہ ہے کہ ایک اعتبار سے حضورؐ صاحبِ تاویل اور صاحبِ تنزیل دونوں ہیں، لیکن چونکہ حضورِ کرمؐ نے اپنی حیاتِ طیّبہ کے دوران اِس کارِ تاویل پر عمل نہیں کیا یعنی چونکہ وہ شریعت کا زمانہ تھا اِس لئے اپنے جانشین کو رسولِ اکرمؐ نے صاحبِ تاویل قرار دیا، تو یہ ہے آپ کے اِس سوال کا جواب۔

ہاں! یہ صحیح ہے اور الفاظ میں فرق ہوسکتا ہے لیکن مفہوم اپنی جگہ پر صحیح ہے۔ آپ نے جو لفظ کہا معلوم نہیں وہ اِس طرح سے ہوسکتا ہے یا نہیں لیکن اُس کے لئے ایک الگ (term) ہے، اُس کو کہتے ہیں شریعت کا اُٹھانا۔ یہ ایک لفظ ہے اور اُٹھانا لفظ صحیح ہے، یہ صحیح ہے اور کئی ایک کتابیں ہیں اُن میں بھی یہ الفاظ آتے ہیں اور روحِ دین کے اندر بھی ایک جگہ پر اِس کا اشارہ ملتا ہے تو یہ بات صحیح ہے۔ نہیں! کسی چیز کو بالکل ختم کرنا یہ (nature) کے خلاف ہے، کسی بھی بات کو بحیثیتِ مجموعی دیکھا جاتا ہے یعنی عنصرِ غالب کو دیکھا جاتا ہے یا جسے آپ (on the whole) کہتے ہیں، اِس کے حساب سے یہ بات ناممکن ہے کہ نمازِ جنازہ نہ ہو، دفن کفن نہ ہو اور شادی بیاہ اور نکاح، طلاق اور ایسی ذبح، حلال، حرام اور دیگر چیزیں نہ رہیں یہ بات درست نہیں ہے۔ ہاں! اِس سلسلے میں ایک (principle) کی بات بتاؤں، کہ دین کے اندر دو قسم کی باتیں پائی جاتی ہیں، ایک قسم کی باتیں اٹل ہیں اُن میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں، اور دوسری قسم کی باتیں ایسی ہیں کہ اُن میں ترمیم ہوسکتی ہیں۔ چنانچہ زمانۂ آدمؑ سے لے کر سارے انبیاءؑ کے سلسلے سے گزر کر آج تلک آپ کو دین کے اندر کچھ باتیں ایسی ملیں گی کہ اُن میں ذرا بھی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے، اِس کے برعکس امور کا ایک گروپ ایسا ملے گا کہ اُس میں تبدیلی کی گنجائش ہے۔ (example) چاہئے اِس کے لئے کہ زمانۂ آدم میں جھوٹ بولنا گناہ تھا یہ ایک ایسی بات ہے کہ اِس میں

تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ اگر کسی زمانے میں جھوٹ بولنے کی اجازت ہو تو اِس سے خرابی ہو سکتی ہے، لہٰذا یہ حکم ایسا ہے کہ اِس کو ہمیشہ کے لئے ایسا ہی رہنا ہے اِس میں تبدیلی کی ذرا گنجائش نہیں ہے۔ اِس قسم کی اور بھی باتوں کا آپ پتا کر سکتے ہیں مثلاً خون، چوری، علیٰ ھٰذا القیاس۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ انسان سمجھتا ہے کہ اُن میں تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ اب اِس کے برعکس جن باتوں میں یا جن امور میں یا دین کے جن معاملات میں یا عبادات میں تبدیلی کی گنجائش ہے اُس کی مثال یہ ہے کہ قربانی کبھی سوختنی تھی جلانے والی قربانی زمانۂ آدم میں اور بعد کے زمانے میں، کبھی اِس قربانی میں انسان کو بھی پیش کیا گیا جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حج کا طریقہ اور طریقِ بندگی اور طریقِ عبادت، قبلہ، زکوٰۃ کا طریقہ اور ثواب کے کاموں میں سے کسی ایک کام کو کسی زمانے میں زیادہ سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے بعد میں کسی اور چیز کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر زمانۂ رسولؐ میں غلاموں کو آزاد کرنا یہ بہت بڑے ثواب کا کام تھا لیکن آج نہیں ہے، یتیموں کو کھانا کھلانا، آج اِس کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ آج اُن ثواب کے کاموں کی جگہ پر ایسے کام سامنے آئے ہیں کہ اُس میں قوم کے بچّوں کو آپ علم و ہنر کی دولت سے مالامال کریں لیکن کبھی یہ نہیں تھا۔ اِس طرح دین میں دو قسم کی باتیں ہیں، کچھ ایسی ہیں کہ اُن میں ترمیمات و تبدیلی واقع ہو سکتی ہیں، کچھ ایسی ہیں کہ وہ بالکل اپنی جگہ پر ہیں۔ اِسی طرح معلوم ہوا کہ یہ ناممکن ہے کہ شریعت کی ساری باتیں اُٹھائی جائیں۔ لیکن یہ کہنا کہ شریعت میں ترمیم ہو گی یا تبدیلی آئے گی تو یہ ایک (on the whole) بات ہے۔ اِس کے علاوہ جب ایک پیغمبر کے بعد دوسرا پیغمبر آیا یا ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب نازل ہوئی، تو اُس دوسری کتاب میں بھی یکسر اگلے احکام کو نہیں مٹایا۔ بہت سارے اُمور کو بحال رکھا۔ مگر اُس میں تبدیلیاں واقع ہوئیں زمانے کے مطابق جہاں پر کہ تبدیلیوں کی گنجائش تھی۔

معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ امام کسی فتنے کو فرو کرنے کے لئے کوئی تدبیر کر سکتے ہیں لیکن اِس لئے نہیں کہ اُس نے بات پوچھے بغیر کہی تھی، کوئی ذمّہ داری دیتے ہیں تو وہ اُس ذمّہ داری کو پوری نہیں کر سکتا ہے یا اُس بوجھ کو بارِ گران سمجھتا ہے تو پھر اِس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے اُس شخص میں کمی ہے، تو پھر آپ اُس سے واپس لے سکتے ہیں تو واپس لینے کے بھی معنی ہیں۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ اُنہوں نے بات واپس کی، لیکن ہم دیکھتے ہیں اسماعیلی مذہب کے اُصول کو اور قرآن کے تقاضوں کو کہ قرآن کا یہ تقاضا تھا کہ ایک مکمل اور (complete) کتاب کی شکل میں قرآن نازل نہیں ہوا تھا اِس میں بھی حکمت تھی کہ وہ (portion by portion) نازل ہوا تھا۔ لوگوں کو یہ تاثر دینے کے لئے کہ جس طرح قرآن کی تنزیل رفتہ رفتہ نازل ہوئی اِس سے کہیں زیادہ عرصے میں اُس کی تاویل واقع ہو گی، کیونکہ تاویل اگرچہ ایک لحاظ سے قرآن کے ساتھ وابستہ تھی لیکن قرآن نے کہا کہ تاویل بعد میں آئے گی۔ ہم نے کبھی لکھا ہے کہ تاویل کے تین مقام ہیں، رُوحانی تاویل امام ہیں، واقعات اور حادثات سے جو تاویل کا تقاضا ہوتا ہے وہ اِس کائنات کے اندر ہے جیسے سائنسی، علمی، فنّی

انقلاب کے بعد کسی تاویل کی ضرورت پیش آتی ہے وہ تو اِس ظاہری کائنات میں ہے۔کہا کہ تاویل آئے گی، اگر ساری تاویل قرآن میں محدود ہوتی تو قرآن کو یہ نہیں کہنا چاہئے تھا کہ تاویل آئے گی (۷:۵۳) جس طرح یہ مناسب نہیں ہے کہ کوئی آیت نازل ہوگی قرآن کے نازل ہو چکنے بعد قرآن کو یہ نہیں کہنا چاہئے کہ ایک اور آیت آنے والی ہے جبکہ سب آیات قرآن میں نازل ہو چکی ہیں۔ اِسی قیاس پر قرآن کو اُس صورت میں یہ نہیں کہنا چاہئے تھا کہ اگر ساری تاویل قرآن میں محدود ہوتی اِس لئے میں نے جو مثال دی تھی وہ صحیح ہے کہ رُوحانی تاویل امام سے وابستہ ہے اور دُنیا میں جو انقلابات کے نتیجے میں جس سے تاویل کا تقاضا ہوتا ہے وہ اِس دُنیا کے اندر ہے اور معنوی تاویل جو لفظوں کے معنی کی حیثیت سے جو تاویل ہونی چاہئے وہ بیشک قرآن ہے یعنی تاویل کے تین پہلو ہیں۔ دُنیا کا ذکر اِس لئے آتا ہے کہ دُنیا ہی اپنے واقعات سے ہمیں سوچنے کے لئے موقع فراہم کرتی ہے۔ ابھی چاند پر لوگ جا پہنچے تو اِس واقعے نے ہمیں نئے سرے سے سوچنے کے لئے ایک دروازہ کھول دیا ایک نیا تصوّر دیا ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیا کہ روزہ کس طرح رکھنا چاہئے یعنی اُن لوگوں کو جو چاند پر جا چکے ہوں گے جبکہ ہم اِس سیارۂ زمین پر رہتے ہیں تو چاند کو دیکھ کر روزہ رکھتے ہیں اور چاند کو دیکھ کر روزہ (complete) کرتے ہیں لیکن اُن لوگوں کے لئے کیا کرنا چاہئے جو چاند پر جا چکے ہوں گے۔ یہ ایک نیا سوال پیدا ہو گیا اور اسی طرح خانۂ کعبہ قبلہ ہے جو یہاں سے مغرب میں پڑتا ہے لیکن جو لوگ قمر پر، چاند پر جا چکے ہوں گے تو اُن کا قبلہ کہاں ہوگا؟ یہ دوسرا سوال۔ حج خانۂ کعبہ میں کیا جاتا ہے جو لوگ عرصۂ دراز تک چاند پر رہیں گے اور حج کرنا چاہیں گے تو وہاں کوئی خانۂ خدا نہیں ہوگا؟ یہ تیسرا سوال ہے وغیرہ، تو اِس سے معلوم ہوا کہ ایسے اور سوالات ہیں جو سائنسی ترقی کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں، تو اِس سے یہ ثابت ہوا کہ تاویل کا ایک عنصر یا کہ تاویل کا ایک تقاضا یا کہ ایک سبب اِس دُنیا کی ترقّی کے ساتھ وابستہ ہے، نئے سرے سے قرآن میں سوچنے اور تاویل کرنے کے مواقع دنیا ہی فراہم کرتی ہے اور قرآن میں یہ گنجائش ہے خداوندِ عالم کو ہر چیز کا علم تھا اور اِس لئے خداوندِ عالم نے اِس قرآن سے ستّر (۷۰) قسم کی تاویلیں وابستہ کر کے رکھی ہیں اور اِس سلسلے میں ایک بات یہ کہیں گے کہ اسلام کی ہدایت تدریجی ہے (gradual guidance) ہے۔ اِس لئے کہ اسلام دینِ فطرت ہے یعنی (natural religion) ہے، تو دینِ فطرت کا یہ تقاضا ہے جس طرح ایک بچے کو ماں کے پیٹ میں کیا غذا کھانی چاہئے وہ خون پیتا ہے، پیدا ہوتا ہے تو دودھ پیتا ہے اور پھر وہ آہستہ آہستہ نرم غذاؤں سے شروع کر کے ایک نوجوان بنتا ہے، تو اُس کی غذا کی مقدار میں اور غذاؤں میں تبدیلی آتی ہے رفتہ رفتہ، جب وہ بوڑھا ہو جاتا ہے تو پھر اُس کے مزاج میں بھی اور غذا میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ اِسی طرح (guidance) جو غذا ہے یہ بتدریج واقع ہے کہ اسلام کے شروع میں، بعد کے دَور میں اُس کے بعد وغیرہ، تو جو ہوشمند لوگ اِس کو قبول کرتے ہیں اور سب سے پہلے اسماعیلی قبول کرتے ہیں کہ ہدایت تدریجی ہے (gradual guidance) ہے اور اِس کا ثبوت یہ ہے کہ تیئیس (۲۳)

سال کے اندر قرآن نازل ہوا ایک ساتھ قرآن نازل نہیں ہوا اور دوسرا ثبوت یہ ہے کہ قرآن کی تاویل پورے زمانے پر پھیلی ہوئی ہے اور سارے اماموں کے زمانے میں کچھ نہ کچھ نئے نئے کام کرنے پڑتے ہیں یہ اُس تاویل کے مطابق ہے ۔امامؑ جو بھی کام کرے گا اُس کو (authority) ہے تو وہ تاویل ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ قرآن کو دیکھے اور کسی آیت کی تلاش کرے اور ریفرینس بھی دے لیکن یہ (natural) ہے کہ امام جو بھی کرے گا قرآن اُس کی تصدیق کرے گا۔

آخر میں ایک بہت اچھی بات بتاتا ہوں کہ رسولؐ نے فرمایا کہ یا اللہ! علی جہاں بھی گھومے تو حق کو اور صداقت کو علی کے ساتھ اور علی کی طرف گھما دینا [وَ اَدِرِالحَقَّ مَعَہُ حَیثُ دَارَ] ۔یعنی مطلب یہ ہوا کہ اگر علی وہاں جائے تو حق یعنی سچائی بھی اُن کے ساتھ وہاں جائے اور اگر علی اِس طرف کو آوے تو سچائی بھی اُن کے پیچھے پیچھے جائے ۔کیا ہی اچھی بات ہے کہ سب لوگ تلاشِ حق کے عنوان سے حق کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں لیکن اِس کے برعکس جو حق ہے، جو سچائی ہے وہ امام کے پیچھے پیچھے چلتی ہے، اِس سے بڑھ کر کوئی دلیل نہیں ہے کہ پیغمبر نے جو فرمایا بہت عالیشان ارشاد ہے ۔اب ہم اِس گفتگو کو ختم کرتے ہیں ۔مہربانی۔

ٹائپنگ: شناوزیر علی　　　نظرِ ثانی: اکبر علی　　　پروف: نسرین اکبر